U12104.   16-12-09.

Title – PREM CHAND.

Editor – Hansraj Rehbar.

Publisher – Hali Publishing House (Delhi).

Date – 1950

Pages – 308

Subjects – Prem Chand – Sawaneh – o – Tanqeed; Tazkira Mosnafeen – Prem chand.

پریم چند

پریم چند

ہنس راج رہبر

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

نقش اول ایک ہزار

اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء

قیمت: تین روپے بارہ آنے

مطبوعہ نعمانی پریس دہلی

نیا دور پبلشرز۔ اکبر منزل، اردو بازار، دہلی

پریم چند کے لڑکے

اپنے دوست

امرت رائے

کے

نام
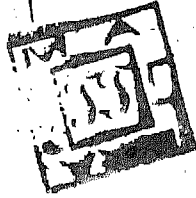
مصنف کی دوسری کتابیں

نیا افق ۔ افسانے

تارو ۔ ناول

ھندی

دھرتی کی بیٹی ۔ ناول

آپ ہاس ۔ کہانیاں

نوکشتنج ۔ کہانیاں

ترتیب

ضمیمہ

اپنی بات

بیس بائیس سال پہلے کا ذکر ہے میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے سکول میں ماہنامہ مخزن (لاہور) آتا تھا۔ میں نے اس میں "منتر" کہانی پڑھی، اس کہانی کا ہیرو۔ بوڑھا بھگت۔ اپنی بے لوث خدمت اور نیک فطرت کے باعث مجھے اتنا پسند آیا کہ وہ انسانی عظمت کا ایک امٹ نقش میرے ذہن پر چھوڑ گیا۔

اور یوں اس کہانی کے مصنف پریم چند سے میں پہلی مرتبہ متعارف ہوا۔

پھر۔ پریم چند کی کوئی بھی چیز — کہانی یا کتاب — ملتی تھی میں اسے شوق سے پڑھتا تھا۔ کالج کے زمانے ہی میں میں نے لگ بھگ ان کی تمام مطبوعہ چیزیں پڑھ ڈالیں، اور جتنا پڑھتا تھا اتنا ہی انھیں دیکھنے کا اشتیاق بڑھتا تھا۔ خوش قسمتی سے اپریل ۱۹۳۶ء میں وہ آریہ سماج کے سالانہ جلسے کے ایک اجلاس کی صدارت کرنے لاہور آئے اور میں انھیں دیکھنے گیا۔ سوچا تھا کہ افسانہ نگاری کے فن پر ان سے کچھ

گفتگو کروں گا۔ لیکن صرف عقیدت سے دیکھتا ہی رہا کچھ کہتے نہ بن پڑا۔

اس کے بعد ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک دور ایسا آیا جب جنس نگاری اور تحلیلِ نفسی کا نام ترقی پسندی تھا اور کہا جاتا تھا کہ پریم چند سے ہمارا افسانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے، نئے ادیبوں کی اس تحریک سے میں بھی بہت حد تک متاثر ہوا۔

مگر بھول جلد سدھر گئی۔ جنگ اور بعد کے واقعات کے باعث جمود ٹوٹا اور طبقاتی شعور بڑھا تو لوگوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ ترقی پسندی کا مطلب تجزیہ نفس اور اجتہاد نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ اس ضمن میں ہمیں پریم چند سے بہت کچھ سیکھنا باقی ہے، چنانچہ میرے دل میں پریم چند کو پھر سے پڑھنے اور ان پر کچھ لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی

دو ڈھائی سال کی محنت کے بعد اپنی یہ کتاب پیش کرتے ہوئے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں، کیونکہ مجھے اس کی افادیت کا یقین ہے۔ اسے لکھتے وقت جو مقصد میرے پیشِ نظر تھا سید احتشام حسین نے "پیش لفظ" میں اس کی اچھی طرح وضاحت کر دی ہے۔

سید احتشام حسین کے علاوہ مجھے اپنے دو ساتھیوں چنی لال آنند اور شیام سندر کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے متعلقہ لٹریچر بہم پہنچا کر میری اعانت کی

ہنسراج رہبر

پیش لفظ

اُردو کے ادیبوں اور نقادوں نے پریم چند کو نہ تو کھلے دل سے خراجِ عقیدت ہی پیش کیا ہے اور نہ پرکھنے والی نگاہ سے ابھی تک ان پر تنقیدی نظر ہی ڈالی ہے، اس سے پریم چند کو نہیں موجودہ دور کے ادیبوں کو خود نقصان پہنچ رہا ہے کیونکہ ہم سے پہلے کے اچھے ادیبوں اور اپنے زمانے کو متاثر کرنے والے مفکروں نے جس طرح اپنے عہد کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی اُس کی روشنی میں ہم کہیں ان کی خامیوں سے بچ کر اور کہیں ان کے شعور اور اسلوب سے فائدہ اٹھا کر اپنے عہد کی آویزشوں کو سمجھ اور سمجھا سکتے ہیں۔ اس لیے پریم چند کی زندگی اور ادبی کارناموں کا مطالعہ ہندوستان کی موجودہ

ادبی تحریکوں کو سمجھنے اور انھیں آگے بڑھانے میں مدد دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ مطالعۂ زندگی اور ادب کے سماجی اور طبقاتی تعلق کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہو۔ پریم چند پر ہنسراج رہبر کی یہ کتاب ایک ایسے ہی مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کمی کو ایک حد تک پورا کرتی ہے۔

پریم چند افسانوی ادب کا ایک عہد اور ایک روایت تھے۔ تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو اُردو افسانے میں سماجی حقیقت پسندی کا آغاز انھیں کے افسانوں سے ہوتا ہے، یہ حقیقت پسندی انسان دوستی اور جانب داری کا رنگ لیئے ہوئے ہے، اس کا ایک سماجی مقصد ہے جسے شروع میں پریم چند نے اصلاحی رنگ دے کر آدرش اور مثالیت کے روپ میں پیش کیا تھا لیکن اپنی زندگی کے آخری دور میں ادب اور زندگی کے تعلق کو سمجھ کر انھوں نے اس ادب کی مذمت کی جو عوام کی خدمت کے جذبے سے سرشار نہ ہو اور جو حرکت اور بے چینی پیدا نہ کرے۔ پریم چند کا یہ ذہنی ارتقا مطالعہ کا اہم موضوع ہے لیکن آج اس مطالعہ کی نوعیت کیا ہو؟ اس سوال کے جواب پر صرف پریم چند ہی کا نہیں، ماضی کے سارے ادیبوں کا مطالعہ منحصر ہے۔

یوں تو پریم چند نے مضامین بھی لکھے ہیں اور ڈرامے بھی لیکن اُردو ادب کے دو شعبے خاص طور سے ان کے قلم کے رہینِ منت ہیں۔ مختصر افسانہ اور ناول —— ان دونوں اصناف کا مطالعہ فن اور موضوع کے لحاظ سے کیا جائے تو پریم چند کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہانیوں کا

موضوع بادشاہوں، شہزادیوں، جنوں اور پریوں سے نیچے اتر کر خاص قسم کے انسانوں تک پہنچ گیا تھا لیکن یہ پریم چند ہی کا کام تھا کہ انھوں نے محنت کش عوام کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا ہیرو بنایا، اور اس دُنیا کی تصویر کھینچی جو سب سے زیادہ جان دار اور سب سے زیادہ حقیقی اور سب سے زیادہ انسان دوستی کی مظہر تھی۔ یہی نہیں میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ اُردو اور ہندی میں پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعے عوام کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش میں انسان دوستی کی طرف یہ قدم اُٹھایا۔ یہ پریم چند کے انفرادی شعور کی بات نہیں ہے، نہ صرف یہ کہنے سے کام چل سکتا ہے کہ وہ انگریزی، فرانسیسی، روسی اور بنگالی ناول نویسوں سے متاثر ہوئے بلکہ اس کی جستجو ان طبقوں کے بدلتے ہوئے مزاج میں کی جانی چاہیے جس میں وہ پیدا ہوئے اور جس کے ساتھ ان کی ہمدردیاں تھیں، بیسویں صدی کے اس ہندوستان کو دیکھنا چاہیئے جو ایک غیر ملکی حکومت کے خلاف آزادی کی جد وجہد کر رہا تھا اور جس کی رہنمائی اعلیٰ اور متوسط طبقے کے ذہین محب وطن کر رہے تھے اور اس ہندوستانی سماج پر نظر ڈالنا چاہیئے جس میں معاشی حالات کے ماتحت طبقاتی کشمکش بھی تیز ہوتی جارہی تھی مگر متوسط طبقہ اس کے مذہبی اور تہذیبی رُخ پر نگاہ جمائے بیٹھے تھا۔ اس ہندوستان میں پریم چند بنارس کے ایک دیہات میں پیدا ہوئے، وہ گاؤں کی زندگی سے واقف ہی نہ تھے بلکہ اس سے جذباتی

اور ہمدردانہ تعلق بھی رکھتے تھے، اُن کا گھر ایک نچلے متوسط طبقے کا گھر تھا۔ حالات ایسے تھے کہ بچپن ہی سے انھیں اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کے لیے میدان عمل میں اترنا اور زمانے کے اونچ نیچ کو دیکھنا پڑا۔ اس لیے پریم چند اپنے حدود کے اندر زندگی کے مسائل کو نیم اصلاحی اور نیم انقلابی نقطۂ نظر ہی سے دیکھ سکتے تھے۔ لیکن ان کی بڑائی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ادبی سفر میں کسی ایسی جگہ قیام نہیں کیا جہاں سے ترقی کا راستہ بند ہو جاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی برابر کوشش کرتے رہے اور بدلے ہوئے حقائق کا ادراک کرتے رہنے کی وجہ سے کبھی ادب محض کی بھول بھلیوں میں گرفتار نہیں ہوئے۔ موزوں موضوع اور مواد کے لیے انھوں نے اسی زندگی کو منتخب کیا جسے وہ اچھی طرح جانتے تھے اور وہی تصویریں بنائیں جن کے کھینچنے میں ان کا موقلم کم سے کم غلطی کر سکتا تھا۔ پریم چند کی کامیابی کا راز ہے زندگی سے ان کی ذاتی واقفیت اور عام انسان سے محبت۔

ہنسراج رہبر نے پریم چند کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے تو اس فضا کو ڈھونڈھ نکالا ہے جس میں پریم چند پیدا ہوئے، پلے اور بڑھے اور جس کی کشمکش میں ان کی ذہنی نشوونما ہوئی اس کے بعد انھوں نے خود پریم چند کی زندگی کا عکس ان کے افسانوں اور ناولوں میں تلاش کیا ہے اسی طرح پریم چند کی حقیقت نگاری

کو ان خارجی حالات کا عکس بنانے کی کوشش کی ہے جن سے اُن کے ماحول کی تخلیق ہوئی تھی۔ یہ طریق کار نیا بھی ہے اور دلچسپ بھی لیکن بعض اوقات اس میں غلطی کا امکان بھی ہے کیونکہ افسانوں اور ناولوں میں بیان کئے ہوئے واقعات اس وقت تک محض داخلی شہادتوں کی حیثیت رکھتے ہیں جب تک قطعی طور پر ہمیں اس کا علم نہ ہو کہ یہ واقعات خود مصنف کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے تخئیل کی مدد سے، افسانوی ضروریات کو مدّنظر رکھ کر، واقعات کو اس طرح بھی ترتیب دے سکتا ہے کہ وہ خود اس کی زندگی سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں، ایسی صورت میں چند ظاہری مشابہتوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ خود اس کی زندگی کے واقعات ہوں گے غلط فہمی بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ناول نویس اور افسانہ نگار اپنے خیالات کا اظہار مختلف کرداروں ہی کے ذریعے سے کرتا ہے، ان کرداروں میں سے بعض سے وہ ایسی باتیں کہلاتا اور ایسے عمل کراتا ہے جنھیں وہ خود پسند کرتا ہے اور بعض کرداروں سے ایسی باتیں کہلاتا ہے جنھیں وہ صحیح نہیں سمجھتا۔ یہ دونوں شکلیں کہانی کے تانے بانے میں گتھی ہوئی ہوتی ہیں اور صرف تنقیدی صلاحیت رکھنے والی آنکھ مصنّف کے اصل مقصد کا پتہ لگا سکتی ہے ایسا ادیب جو کوئی فلسفۂ زندگی نہ رکھتا ہو یا اپنے خیالات پر پردہ ڈالنے کے لیے ناکام ہی طور پر سہی، یہ کہتا ہو کہ اس کے کرداروں میں سے کوئی بھی اس کے خیالوں کا ترجمان نہیں، اس کے یہاں تو

یہ دقت پیش آسکتی ہو (حالاں کہ نقاد کی نگاہ سے چھپ نہیں سکتی) لیکن نیکی اور بدی کے معاملے میں، سماج کی اچھائی اور برائی کے معاملے میں ہر اچھے ادیب کا نقطۂ نظر اس کے کردار۔ وں ہی کی بات چیت اور ہرکات وسکنات سے ظاہر ہوجاتا ہی اس لیے رہبر کی یہ خواہش عبث نہیں کہ وہ پریم چند کی زندگی کی کہانی خود ان کی کہانیوں میں تلاش کریں اور ان کے خیالات کے نشیب وفراز ان کے کردا۔ وں کے خیالات کے نشیب و فراز میں ڈھونڈھیں، مگر جہاں تک سوانح حیات کا تعلق ہی اس میں کافی چھان بین کی ضرورت ہوگی۔ رہبر نے حتی الوسع غلطی کے امکانات سے بچنے کے لئے پریم چند کی زندگی کے انھیں واقعات کو کہانیوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہی جو خود انھوں نے، محترمہ شیورانی دیوی نے یا کسی اور واقفکار نے لکھے ہیں یا عام طور پر معلوم ہیں۔ اس احتیاط پسندی کی وجہ سے پریم چند کی زندگی اور افسانوی حقائق کم وبیش بڑی خوبی کے ساتھ منطبق ہوگئے ہیں اور رہبر اپنی اس مخصوص کاوش میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

زندگی کے مقابلے میں رہبر نے پریم چند کے فن پر بہت کم لکھا ہی اور شاید انھوں نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہی تاہم کتاب کے آخری دو ابواب میں پریم چند کے ادبی معتقدات کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا گیا ہی۔ پریم چند ادب میں کیا چاہتے تھے، ادیب سے کس بات

کی توقع رکھتے تھے، حقیقت کے متعلق ان کا کیا خیال تھا، ادب اور زندگی کے تعلق کے بارے میں وہ کیا رائے رکھتے تھے، جب تک یہ باتیں سمجھ میں نہ آجائیں یہ بھی نہیں سمجھا جا سکتا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی اور طبقاتی کشمکش کے متعلق پریم چند کا رویہ کیا تھا۔ رہبر نے دونوں کی حدوں کو نمایاں کرنے میں بڑی اچھی تنقیدی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ پریم چند کے فن میں جو ترقی پسند رجحانات ہیں ان کو ان کی طبقاتی کمزوریوں سے الگ کرکے دیکھنا ہی پریم چند کی سچی ادبی عظمت کو نمایاں کر سکتا ہے اور موجودہ دور کے ادیب اس روایت کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لیے یہی کر سکتے ہیں کہ پریم چند کی زندگی اور تصنیفات کی روشنی میں اس تضاد سے بچنے کی کوشش کریں جس کا شکار اپنی عظمت کے باوجود وہ بعض اوقات ہو جاتے تھے۔ پریم چند نے جس طرح ہندوستانی عوام کی زندگی کو سمجھا جس طرح ان کی خواہشوں اور خوابوں کو پیش کیا اور جس طرح عوام کے اندر سوئی اور کچلی ہوئی انسانیت کو جگانے کی کوشش کی ہے اس سے آج کے ادیب نہ صرف سبق لے سکتے ہیں بلکہ اپنی تخلیقات میں زندگی اور توانائی کی روح پھونک سکتے ہیں۔

اگر میں نے رہبر کے اس مطالعہ کو سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے تو میرا خیال ہے کہ انھوں نے بھی یہ کتاب لکھ کر اسی اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ افسانہ نگار رہبر کی یہ پہلی تنقیدی

اور علمی کاوش مقبول ہوگی اور پریم چند کے سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔

سیّد احتشام حسین

لکھنؤ یونی ورسٹی
یکم مارچ ۵۷ء

بچپن

میری زندگی ہموار میدان کی طرح ہے
جس میں کہیں کہیں گڑھے تو ہیں لیکن
ٹیلوں، پہاڑوں گہری گھاٹیوں کا کہیں
پتہ نہیں چلتا۔
(پریم چند)

ادبی دنیا جس شخص کو پریم چند کے نام سے جانتی ہے اس کا اصل نام دھنپت رائے تھا اصل نام سے مراد وہ نام ہی جسے والدین یا رشتے دار تجویز کرتے ہیں جس میں ان کی محبت اور ممتا کی گھلاوٹ رہتی ہے اور جو بچپن سے آخری عمر تک آدمی کی زندگی کا جزبنا رہتا ہے۔

دھنپت رائے کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانہ میں کلرک تھے۔ اور اس زمانے میں کلرک کو منشی کہتے تھے۔ مسلسل منشی گیری کرتے رہنے سے "منشی" خاندانی لقب بن جاتا تھا۔ منشی عجائب لال شروع شروع میں پندرہ بیس روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ چالیس روپے تک پہنچتے پہنچتے ان کا انتقال ہو گیا۔ اس قلیل تنخواہ کے علاوہ ان کے پاس تھوڑی سی موروثی زمین بھی تھی۔ لیکن اس کی آمدنی بہت ہی معمولی تھی۔ اس لیے بزرگوں کو منشی گیری اختیار کرنا پڑی تھی۔ لیکن ملازمت کے باوجود نچلے درمیانہ طبقے کے عام لوگوں سے ان کی حالت بہتر نہ تھی۔ ہاں صرف زمین کی آمدنی پر گذر بسر کرنے والے کسانوں سے قدرے اچھی ضرور تھی۔ اس لیے دھنپت رائے اور ان کے والد کسان نہیں تھے لیکن کسانوں سے دور بھی نہیں تھے۔ وہ کسانوں کے رنج و غم، مشکلات اور چھوٹی چھوٹی خواہشات سے اچھی طرح واقف تھے بلکہ یہ سفید پوش طبقہ ظاہرداری اور رسم و رواج کا کسانوں سے کچھ زیادہ پابند ہوتا ہی اسی اعتبار سے اس کی مصیبتیں اور رنج و غم بھی زیادہ ہوتے ہیں، اور نا آسودہ خواہشات افلاس کی دلدل میں کلبلاتی رہتی ہیں۔

دھنپت رائے کا جنم ۱۸۸۰ء مطابق سمت ۱۹۳۷ بکری میں موضع لمہی میں ہوا۔ یہ گاؤں پانڈے پور کے قریب بنارس سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ باپ چونکہ ڈاک خانہ میں ملازم

تھا اس لیئے ڈاک خانہ کا ماحول اور اس کے ملازموں کی زندگی کی جھلک پریم چند کی کہانیوں میں اکثر ملتی ہے، اور انھی کہانیوں سے ان کے بچپن کی واضح تصویر بھی ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

"قزاقی ذات کا پاسی تھا ..... روزانہ ڈاک کا تھیلا لے کر آتا .... جب وہ دوڑتا تو اس کے بلم کے گھنگرو بجنے لگتے" بلم کے گھنگرو سن کر اس بچے پر جو گذرتی ذرا وہ بھی سنئے :-

"میرا دل فرطِ مسرت سے زیادہ اُچھلنے لگتا۔ خوشی کی اُمنگ میں میں بھی دوڑ جاتا۔ اور ایک لمحہ میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن بن جاتا وہ مقام میری تمناؤں کا بہشت تھا۔ بہشت والوں کو بھی شاید وہ مسرت و سرور نہ ملتا ہوگا جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پر ملتا تھا۔ دنیا میری نگاہوں میں ہیچ ہو جاتی۔ جب قزاقی مجھے اپنے کندھوں پر لئے دوڑنے لگتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میں ہوا کے گھوڑے پر دوڑا جا رہا ہوں"

جس ہرکارے کا کندھا ننھے دھنپت رائے کا سنگھاسن بنتا تھا اس کا نام شائد قزاقی نہ ہو۔ شاید اسے افسانہ نویس پریم چند نے بدل دیا ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ اس ڈاک خانہ کا ہرکارہ تھا جس میں دھنپت رائے کا باپ کلرک تھا۔ بچے کو قزاقی کا پیار حاصل ہے جب اسے کسی وجہ سے ملازمت سے علاحدہ کیا جاتا ہے تو بچے کو اس کا دلی رنج ہوتا ہے اور وہ ماں کے پاس باپ کی فریاد لے کر جاتا ہے۔

جب فریاد سے بھی کچھ نہیں بن پڑتا تو بچے کے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ اس افسانے میں اس طرح پیش کی گئی ہے "کھانا تو میں نے کھا لیا کیونکہ بچے غم میں بھی کھانا نہیں ترک کرتے۔ اور خصوصاً جب ربڑی بھی سامنے ہو۔" اور غم کی تلافی کے لئے صرف ربڑی ہی کافی نہیں بلکہ "وہ بیٹھے بیٹھے سوچتا ہے کہ ایک عالی شان محل بنواؤں گا جس میں اپنے منّو (ہرن کے بچّے) کے لیے علیحدہ کمرہ اور پلنگ ہوگا۔ علیحدہ فٹن بھی اس طرح ہزاروں ہوائی قلعے بناتا اور بگاڑتا ہے۔"

ہوائی قلعے بنانا بچپن کی خصوصیت ہے، در اصل ہوائی قلعے ہی بچپن کو سہانا اور خوبصورت بناتے ہیں، اُسے مسرتوں سے مالامال کرتے ہیں۔ پریم چند اپنی طفلانہ مسرتوں کا اظہار بار ہا کرتے ہیں کہیں جب براں نکلتا ہے تو رام چندر کے پیچھے بیٹھ کر محسوس کرتے ہیں کہ "میں جنت میں بیٹھا ہوں،" لیکن وہ گلی ڈنڈا کھیلنے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور براں نکلتا ہے مگر وہ کھیلنا نہیں چھوڑتے، کیونکہ انھیں اپنا داؤں لینا ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنا داؤں چھوڑنے کے لئے اس سے کہیں زیادہ ایثار کی ضرورت تھی، جتنا میں کر سکتا تھا۔"

کہانیوں سے ان کے خانگی حالات اور باپ کی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے "کپتان" کہانی میں جگت سنگھ کے باپ کا جو تعارف کرایا گیا ہے وہ ان کے اپنے باپ کے تعارف سے مختلف نہیں ہے۔ "اس کے باپ ٹھاکر بھگت سنگھ اپنے محلے کے ڈاک خانے

کے منشی تھے۔ بڑی کوشش اور منتوں کے بعد افسروں نے انھیں وطن کا ڈاک خانہ دے دیا۔ لیکن بھگت سنگھ جن ارادوں سے گھر آئے تھے وہ ایک بھی پورا نہ ہوا۔ اُلٹا نقصان ہوا کہ آمدنی کی وہ صورتیں جن سے مفصّلات میں وہ مستفید ہوتے تھے یہاں مسدود ہوگئیں ....."

منشی عجائب لال بھی اپنے ہی محلے میں ڈاک خانے کے ملازم تھے ان کے ارادے بھی پورے نہ ہوتے تھے۔ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے تھے۔ قلیل آمدنی کے باعث بہت سی خواہشات کا خون ہو جاتا تھا۔ اگر "غبن" کے دیا ناتھ کو کریدا جائے تو منشی عجائب لال کی سیرت کا پتہ چل جاتا ہے۔ دیا ناتھ اپنے ظاہر پرست اور فضول خرچ بیٹے رما ناتھ سے کہتا ہے "تمھارا بڑھتا ہوا خرچ دیکھ کر میرے دل میں شبہ پیدا ہوا تھا۔ میں اسے چھپا نہیں سکا۔ لیکن جب تم کہہ رہے ہو کہ تمھاری نیت صاف ہے تو مجھے اطمینان ہوگیا۔ میری صرف یہی منشا ہے کہ میرا لڑکا چاہے غریب رہے مگر نیت دُرست رکھے۔"

پریم چند نے ایک چھوٹے سے مضمون میں اپنے حالات زندگی قلم بند کرتے ہوئے ان کی بابت صرف ایک ہی فقرہ لکھا ہے۔ "وہ بڑے دور اندیش، محتاط اور دنیا میں آنکھیں کھول کر چلنے والے آدمی تھے لیکن آخری عمر میں ٹھوکر کھا ہی گئے۔"

تنگی ترشی میں زندگی بسر کرنے والا درمیانہ طبقے کا دور اندیش

آدمی اپنے بچے کے لیے یہی خواہش کرسکتا ہے کہ وہ نیک چلن ہو، اس کی نیت صاف ہو یہی اس کی سب سے بڑی وراثت ہے۔ نیک چلنی اور نیک نیتی کا فخر ہی اسے تمام مصائب برداشت کرنے کے اہل بناتا ہے۔ تمام خواہشات کا خون کرکے بھی جینا اپنا حق سمجھتا ہے۔

جس گھر میں تنگ دستی کا نام کفایت ہو اور معمولی معمولی مسرتیں بھی پوری نہ ہوتی ہوں اس میں بچے کے جو طور اطوار اور عادات بن جاتی ہیں اس کا پتہ ہمیں پریم چند کی کہانیوں سے چلتا ہے، مثلاً انھیں بچپن سے پیسے جمع کرنے کی عادت تھی جو بعد میں چھوٹ گئی کیونکہ بعد میں غریبی اتنی بڑھ گئی کہ وہ پیوند لگانے سے بھی پھٹ جاتی تھی پھر پیسے کیسے جمع ہوں۔ ڈاک خانے کا کلرک اپنے بیٹے کو زیادہ پیسے دینے کی توفیق نہیں رکھتا تھا اور خانگی زندگی بھی فارغ البالی سے نہیں گزرتی تھی اس لیے دھنپت رائے دوسرے بچوں کی طرح من مانی چیزیں کھانے کو ترستا رہا۔ "ہولی کی چھٹی" ان کی اپنی زندگی کا واقعہ معلوم ہوتا ہے، گو وہ لڑکپن کا واقعہ ہے لیکن گڑ چرا کر کھانے کی ابتدا بچپن ہی سے ہوئی ہوگی۔ لذیذ کھانا پریم چند کی خاص کمزوری تھی۔ بچپن کی محرومیوں ہی نے یہ کمزوری پیدا کی تھی جس سے وہ ساری عمر چھٹکارا حاصل نہ کرسکے۔

خارجی ماحول کی محرومیاں آدمی کو تخیل پرست بنا دیتی ہیں۔

زندگی میں جن مسرتوں کا فقدان ہوتا ہے آدمی انھیں تخئیل میں ڈھونڈھتا ہے ہوائی قلعے بناتا ہے، ننھا دھنپت رائے جن عالی شان محلوں کے خواب دیکھا کرتا وہ اسے ساری عمر میسر نہ آئے۔ لیکن اسی تخئیل پرستی نے پریم چند کو نئی اور بہتر زندگی کا معمار بنا دیا۔ بڑے ہوکر انھوں نے اپنی کہانیوں میں یہ ہوائی قلعے جا بجا بنائے ہیں اور انھیں زمین پر اتارنے کے لیئے جد و جہد کی ہے۔

جہاں وہ بچپن میں ہوائی قلعے بناتے تھے وہاں انھیں کہانیاں سننے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ان کی ایک کتاب "میرے بہترین افسانے" ہے اس کا دیباچہ انھوں نے خود لکھا ہے جس میں وہ تحریر کرتے ہیں۔ "ہر بچے کو اپنے بچپن کی کہانیاں یاد ہوں گی۔ جو اس نے اپنی والدہ یا بہن سے سنی تھیں۔ کہانیاں سننے کے لیے وہ کس قدر بے قرار رہتا تھا کہ کہانی شروع ہوتے ہی وہ کس انہماک سے اسے سنتا تھا۔ کتّے اور بلّیوں کی کہانیاں سن سن کر وہ کس قدر خوش ہوتا تھا۔ اسے وہ شاید کبھی نہیں بھول سکتا۔ عہدِ طفلی کی یادوں میں سب سے خوش گوار یاد شاید کہانی ہی ہے۔ کھلونے، مٹھائیاں اور کھیل تماشے تو تقریباً سبھی ذہن سے اتر چکے ہیں۔ محض انھی کہانیوں کی یاد ذہن میں باقی ہے۔"

بچّے کہانیاں عموماً دادی سے سنتے ہیں۔ پریم چند نے جانے اس مضمون میں دادی کیوں نہیں لکھا ہے حالانکہ دادی موجود تھیں اور ان کے علاوہ گھر میں صرف چار افراد تھے۔ ماں، باپ، بہن اور خود

دھنپت رائے، بہرکیف پریم چند کو جب بچپن کی کہانی کی خوش گوار یاد آئی تو وہ ماں اور بہن کی مسرت افروز یاد بھی فراموش نہیں کرسکے کیونکہ کہانیوں سے سُنانے والے کی شخصیت وابستہ ہوتی ہے ان پر اس کی محبت اور ممتا کی مہر ثبت رہتی ہے۔

لیکن پریم چند کا بچپن محبت سے محروم رہا۔ ماں شروع سے بیمار رہتی تھی۔ باپ کو دوا دارو سے فرصت نہیں ملتی تھی، اور جب پریم چند سات سال کی عمر کو پہنچے تو دائم المریض ماں چل بسی۔ ماں کی بے وقت موت نے معصوم بچے کے دل کو سخت صدمہ پہنچایا۔ پریم چند اس صدمہ کو کبھی فراموش نہیں کرسکے، انھوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں اس صدمے کا بہت ہی دردناک پیرایہ میں بارہا ذکر کیا ہے۔ مثلاً "تحریک" کہانی میں سوگرز کا حکیمہ کاٹ کر لکھا ہے:—

"بچوں میں پیار کی جو ایک بھوک ہوتی ہے، دودھ اور مٹھائی اور کھلونوں سے بھی زیادہ مرغوب۔ جو ماں کی گود کے سامنے دنیا کی کسی چیز کی ہستی کو خیال میں نہیں لاتی، موہن میں اس بھوک نے کبھی سیری کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ پہاڑوں سے ٹکرانے والی سارس کی صدا کی طرح وہ ہمیشہ اس کی ایک ایک رگ میں گونجا کرتی تھی۔ جیسے زمین پر پھیلی ہوئی لتا کوئی سہارا پاتے ہی اس سے چمٹ جاتی ہے وہی حال موہن کا تھا۔۔۔۔۔"

"میدانِ عمل" کا ہیرو بھی پریم چند نہ ہو لیکن وہ بھی بچپن میں ماں کی گود سے محروم ہو گیا تھا۔ لکھتے ہیں

"امرکانت نے اپنی زندگی میں ماں کی ممتا کے مزے نہ اٹھائے تھے۔ قدرت نے اسے اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم کر دیا تھا۔ جب اس کی ماں کی وفات ہوئی تو وہ بہت چھوٹا تھا۔ اس ماضیٔ بعید کی کچھ موہوم سی اور اس لیے نہایت دلفریب اور پرلطف یادیں باقی تھیں۔"

اسی ناول میں امرکانت کی زبانی اپنے اس ناقابلِ فراموش دکھ کا اظہار ایک دوسری جگہ یوں کرتے ہیں :-

"زندگی کی وہ عمر جب انسان کو محبت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، بچپن ہے، اس وقت پودے کو تری مل جائے تو اس کی جڑیں ہمیشہ کے لیے مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اس وقت خوراک نہ پاکر اس کی حیات کی نمی خشک ہو جاتی ہے۔ میری ماں کا اسی زمانہ میں انتقال ہوا اور تب سے میری روح کو اس کی غذا میسر نہ ہوئی وہی بھوک میری زندگی ہے۔ مجھے محبت کا جہاں ایک ریزہ بھی ملے گا۔ میں بے اختیار اس کی طرف دوڑوں گا، یہ فطرت کا اٹل قانون ہے اگر اس کے لیے کوئی مجھے خطاوار کہے تو میں اسے اپنی خطا تسلیم نہیں کرتا۔ دنیا میں سب سے بدنصیب وہ ہے جس کی ماں بچپن میں مرگئی ہو"

اور اس سے بھی زیادہ بدنصیبی یہ تھی کہ باپ نے فوراً دوسرا بیاہ

کرلیا تھا اور ننھے دھنپت کو ایسی سوتیلی ماں سے پالا پڑا جو اس کے ساتھ بڑی بے مروتی اور سنگدلی سے پیش آتی تھی۔"علیحدگی" کہانی میں انھوں نے اس بات کا ذکر یوں کیا ہے:-

" بھولا مہتو نے پہلی عورت کے مرجانے کے بعد دوسری سگائی کی تو اس کے لڑکے رگھو کے لیئے مصیبت کے دن آگئے۔ رگھو کی عمر اس وقت کل دس سال کی تھی۔ مزے سے گاؤں میں گلی ڈنڈا کھیلتا پھرتا تھا، نئی ماں کے آتے ہی چکی میں جتنا پڑا۔ پنا حسین عورت تھی اور حُسن کے ساتھ غرور ہوتا ہی۔ وہ اپنے ہاتھ سے کوئی موٹا کام نہ کرتی۔ گوبر رگھو نکالتا۔ بیلوں کو سانی رگھو دیتا۔ رگھو ہی گھر کے برتن مانجتا۔ بھولا کی آنکھیں کچھ ایسی پھریں کہ اُسے اب رگھو میں ایئا ہی نظر آتیں پنا کی باتوں کو وہ رواج قدیم کے مطابق آنکھیں بند کرکے مان لیتا تھا۔ رگھو کی شکائتوں کی مطلق پروا نہ کرتا نتیجہ یہ ہوا کہ رگھو نے شکایت کرنا چھوڑ دی۔ کس کے سامنے روئے؟ ..."

اس کیفیت کی پوری ترجمانی "سوتیلی ماں" کہانی میں ملتی ہی جس کے ایک ایک لفظ میں پریم چند نے بچپن کا درد بھر دیا ہے، اور سب سے رقت انگیز ٹکڑا وہ ہی جہاں بچہ دیوار کی طرف منھ کیئے کھڑا رو رہا ہی، لیکن یکایک باپ کے آجانے پر جھٹ پٹ آنکھیں پونچھ لیتا ہی اور جب اس کی غمگین صورت دیکھ کر باپ پوچھتا ہی کہ تو روتا کیوں تھا؟ کیا تمھیں تمھاری ماں نے پیٹا تھا تو بچہ جواب دیتا ہے"نہیں، وہ

تو بہت اچھی ہیں۔

دور اندیش باپ کے ٹھوکر کھانے سے یہ دوسری شادی مراد ہے۔ اس وقت ان کی آخری عمر تھی وہ چالیس سے متجاوز تھے" وفا کا دیوتا" کہانی میں درج ہے۔" مہاشہ ہوری لال کی بیوی کا جب انتقال ہوا وہ ایک طرح سے دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے اور تب مہاشہ جی کا پینتالیسواں سال تھا۔ گٹھا ہوا جسم تھا۔ صحت اچھی تھی، خوش دل اور خوش طبع واقع ہوئے تھے"

مہاشہ ہوری لال نے دوسرا بیاہ نہیں کرایا اس لیے انھیں منشی عجائب لال کا صحیح کردار تو نہیں کہا جا سکتا۔ تھوڑا بہت ردو بدل ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب پریم چند کی والدہ کا انتقال ہوا تو ان کے والد کی عمر ڈھل چکی تھی۔ ان کے دولھا بن کر برات چڑھنے کا نقشہ " بھوت " کہانی میں یوں پیش کیا ہے :-

" چوبے جی کی سج دھج آج دیکھنے لائق تھی تن زیب کا رنگین کرتہ، کتری اور سنواری ہوئی مونچھیں، خضاب سے چمکتے ہوئے بال، ہنستا ہوا چہرہ، چڑھی ہوئی آنکھیں۔ جوانی کا پورا سوانگ تھا"

غریبی اور سوتیلی ماں کا جبر اور باپ کی سرد مہری اور بے التفاتی۔ یہ ماحول تھا جس میں پریم چند کا بچپن بسر ہوا مگر انھوں نے گھر کی گھٹن سے طبیعت کو پژمردہ نہیں ہونے دیا۔ باہر کی کھلی فضا میں محرومیوں کا بدل تلاش کیا۔ "خانہ داماد" کہانی میں ایک ایسے ہی لڑکے کا

کردار پیش کیا ہے جسے گھر سے زیادہ درختوں کے سائے میں سکون ملتا ہے۔ آئندہ عمر میں جب کبھی بچپن کی یاد آتی تھی تو دل میں ہوک سی اٹھتی تھی، وہ ان الفاظ میں اسے یاد کرتے ہیں:-

"ہائے بچپن تیری یاد نہیں بھولتی! وہ کچا..... گھر..... وہ برہنہ پا، برہنہ جسم کھیتوں میں گھومنا، آم کے درختوں پر چڑھنا، ساری باتیں نگاہوں میں پھر رہی ہیں۔"

سکول

زندگی کی تکمیل کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے
ڈگری کی نہیں۔ (پریم چند)

بچے ذرا بڑے ہوں تو انھیں سکول بھیج دیا جاتا ہے۔ ان دنوں سکول زیادہ نہیں تھے۔ تعلیم کا آغاز عام طور پر مدرسے سے ہوتا تھا جو مغلوں کے وقت سے چلے آتے تھے۔ پڑھانے والے مولوی ہوتے تھے اور اردو فارسی کا رواج عام تھا۔ منشی پریم چند ذات کے سریواستو کائستھ تھے چونکہ یہ لوگ ملازمت کرتے تھے اس لئے فارسی اور اردو سے خاص رغبت رکھتے تھے۔ منشی پریم چند نے بھی اردو فارسی سیکھی اور تعلیم کا آغاز مدرسے سے ہوا۔ انھوں نے مدرسے جانے کا حال

اپنے ایک افسانہ "چوری" میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"دوسرے گاؤں میں ایک مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ میری عمر آٹھ سال کی تھی۔ علی الصباح جَو کی روٹیاں کھا کر ...... روانہ ہو جاتے تھے۔ مولوی صاحب کے ہاں حاضری کا رجسٹر تو تھا ہی نہیں پھر خوف کس بات کا۔ کبھی تو تھانے کے سامنے کھڑے سپاہیوں کی قواعد دیکھتے۔ کبھی کسی ریچھ یا بندر نچانے والے مداری کے پیچھے پیچھے گھومنے میں دن گزار دیتے۔ کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے اور گاڑیوں کی بہار دیکھتے ــــ کبھی ہم ہفتوں غیر حاضر رہتے مگر مولوی صاحب سے ایسا بہانہ کر دیتے کہ ان کی چڑھی تیوریاں اتر جاتیں "

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ دھنپت رائے کی طبیعت میں آوارگی کو کافی دخل تھا۔ "کپتان" کہانی کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس کہانی کے ہیرو جگت سنگھ کو دھنپت رائے سے اس لئے مناسبت ہے کہ " اس کے باپ ٹھاکر بھگت سنگھ اپنے قصبے کے ڈاک خانے کے منشی تھے " اس کہانی میں پریم چند نے جگت سنگھ کے لڑکپن کی یہ تصویر پیش کی ہے :-

"جگت سنگھ کو کتابوں سے نفرت تھی۔ وہ سیلانی، آوارہ گرد گھمکڑ نوجوان تھا۔ کبھی امرود کے باغوں کی طرف نکل جاتا اور باغبان کے ہاتھ سے گالیاں کھاتا کبھی دریا کی سیر کرتا اور ملاحوں کی

کشتیوں میں بیٹھ کر پار نکل جاتا۔ گالیوں میں مزہ آتا تھا۔ اسے بینڈ باجا بہت پسند تھا۔ بینڈ کا کوئی دن ناغہ نہ کرتا تھا۔۔۔"

ممکن ہے اس میں کچھ مبالغہ ہو پھر بھی اس میں پریم چند کے اپنے لڑکپن کی تصویر نظر آتی ہے کیونکہ وہی گاؤں کا ماحول ہے۔ درخت ہیں۔ اور دریا کا کنارہ ہے۔ ہر دو اقتباسات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ دھنپت رائے کو مدرسہ سے، مولوی سے اور کتابوں سے کوئی خاص انس نہیں تھا۔ وہ مدرسہ کی "طوطا رٹنت" سے کھلی فضا میں گھومنا گالیاں کھانا اور بینڈ سننا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اپنے اس جذبہ کو آئندہ تجربہ کی روشنی میں انھوں نے "تحریک کہانی" میں بہت اچھی طرح پیش کیا ہے۔

"نیم تعلیم یافتہ فاقہ کش مدرسوں سے آپ یہ امید نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی اونچا معیار پیش نظر رکھ سکیں، زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہوگا کہ چار یا پانچ سال میں لڑکا حرف شناس ہو جائے گا۔ میں اسے "کوہ کندن و کاہ آبردن" کے مصداق سمجھتا ہوں۔ سن شعور میں یہ مرحلہ ایک مہینہ میں آسانی سے طے کیا جا سکتا ہے میں تجربہ سے کہہ سکتا ہوں کہ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں جتنا ہم ایک۔۔۔ مہینہ میں پڑھ سکتے ہیں۔ اتنا چھ سات سال کی عمر میں تین سال میں بھی نہیں پڑھ سکتے۔ خواہ مخواہ بچوں کو مدرسہ میں قید کرانے سے فائدہ؟ یوں چاہیے اسے روٹیاں نہ ملتیں مگر تازہ ہوا تو ملتی۔ فطرت سے تجربات تو حاصل کرتا۔ مدرسہ میں بند کر کے تو آپ اسے ذہنی اور جسمانی دونوں ترقیوں سے ہی محروم کر دیتے ہیں۔۔۔"

انگریزی عملداری کے بعد بھی گاؤں میں جاگیردارانہ ڈھنگ کے مدرسے قائم تھے جنھیں نیم تعلیم یافتہ نکمے اور کاہل الوجود مولوی چلاتے تھے نہ ان کے پاس کوئی

رجسٹر ہوتا تھا اور نہ انھیں بچوّں کی ذہنی نشو ونما سے کوئی علاقہ تھا۔ وہ قاعدے اور سپارے رٹاتے تھے اگر کوئی بچہ رٹ کر نہ آتا تھا تو پیٹتے تھے۔ وہ تعلیم کو تخلیقی قوتوں کو بیدار کرنے اور نشو و نما دینے کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ تعلیم کا یہ میکانکی ڈھنگ بچے کو اپنے ارتقا پسند شعور پر جبر محسوس ہوتا ہے۔ ایسے میں مدرسے اور کتابوں سے نفرت ہو جانا لازمی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حساس دھنپت رائے مدرسہ سے ہفتوں غائب رہتے تھے اور کھیتوں اور باغوں میں گھوم کر فطرت سے تجربات حاصل کرتے تھے۔ سپاہیوں کی قواعد دیکھتے اور بینڈ سنتے تھے اس آوارگی میں ان کا چچازاد بھائی بھی ان کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ جو عمر میں ان سے بڑا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے گھر سے چچا کا ایک روپیہ چرایا اور دریا کے کنارے بیٹھ کر مٹھائی اور پھل کھائے بعد میں چوری کا علم ہو گیا۔ اسی لئے چچازاد بھائی کی خوب مرمت ہوئی

اس اثنا میں منشی عجائب لال کی ترقی ہو گئی اور انھیں ڈاک منشی بنا کر گورکھپور بھیج دیا گیا۔ دھنپت رائے بھی باپ کے ساتھ گاؤں سے شہر میں آ گئے اور اب وہ مدرسہ کی بجائے سکول میں داخل ہوئے گو سکولوں میں بھی بچوں کی نشو و نما کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ کیونکہ انگریزوں کا مقصد بھی ہندوستانیوں کو تعلیم یافتہ بنانا نہیں بلکہ اپنی دفتری حکومت کے لئے کلرک پیدا کرنا تھا اور ان کے بعد کانگرس راج میں بھی وہی سسٹم جاری ہے۔ لیکن بہر کیف۔ سکول مدرسہ سے بہتر تھا۔ یہاں پریم چند صحیح پڑھنے کی طرف مائل ہوئے۔

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے ایک مضمون بعنوان "پریم چند" لکھا ہے جس میں ان کی گورکھپور کی سکول کی زندگی کو یوں بیان کیا ہے۔

"اس طبقہ کے دوسرے لڑکوں کی طرح پریم چند بھی ایک ہائی سکول میں داخل ہوگئے۔ اور ان کی تعلیم ابتدائی درجوں کو چھوڑ کر گورکھپور کے ایک سکول میں شروع ہوگئی جہاں ان کے والد ملازم تھے۔ پریم چند نے مجھ سے بتایا کہ لڑکپن میں ان کی دوستی اپنے درجہ کے ایک لڑکے سے ہوگئی جو ایک تمباکو فروش کا بیٹا تھا روزانہ وہ اپنے کم عمر دوست کے ساتھ اسکول کے بعد اس کے مکان پر جاتے تھے۔ وہاں تمباکو کے بڑے بڑے سیاہ پنڈوں کے پیچھے تمباکو فروش اور اس کے احباب بیٹھ کر ~~بڑا~~ حقہ پیتے اور طلسم ہوشربا پڑھتے تھے ------ یہاں پریم چند اپنے کمسن دوست کے ساتھ بیٹھ کر طلسم ہوشربا کے افسانے سنتے تھے یہاں تک کے شام ہوجاتی جب وہ اپنے گھر چلے جاتے یہ سلسلہ تقریباً ایک سال جاری رہا۔ لیکن اس اثناء میں پریم چند ہمیشہ کے لئے رومانی کہانیوں میں ڈوب گئے۔ درحقیقت ان قصوں اور کہانیوں کو جس دلچسپی اور اشتیاق سے انھوں نے سنا تھا اس سے ان کے قوتِ بیان میں روانی اور وضاحت کے انداز جذب ہوگئے اور ان لذیذ حکایتوں کی روح ان میں تحلیل ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد یہی قوتیں۔ پریم چند کی تصانیف میں کس حسن سے پھلی پھولیں۔"

راجا رانی اور پریوں کے شہزادے کی کہانیاں سنانے والی ماں مدت ہوئی مرچکی تھی اور گاؤں کا کھلا ماحول بھی نہیں تھا۔ لیکن زندگی کی تلخیاں بڑھ گئی تھیں اب انھیں جھوٹے برتن ہی نہیں مانجنا ہوتے تھے بلکہ سوتیلی ماں کے بچے کو کھلانا بھی ہوتا تھا۔ بچے کو کھلانا کتاب پڑھنے سے کم رومان انگیز نہیں۔ لیکن تبھی نا جب اسے اپنی مرضی اور شوق سے کھلایا جائے۔ لیکن سوتیلی ماں انھیں اپنا غلام سمجھ کر دھونس سے کام لیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دل میں ماں کی طرف سے روز بروز مغائرت بڑھتی جاتی

تھی اور وہ "طلسم ہوشربا" میں گھر کی تلخیوں کا بدل ڈھونڈتے تھے۔ جو انھیں اس کہانی کے رومان میں مل جاتا تھا۔ یعنی وہ تمباکو کی دوکان پر کتاب ہی نہیں سنتے تھے اپنے غم کا مداوا بھی کرتے تھے۔ شاید اسی لئے انھوں نے جلد اس راز کو پالیا کہ ادیب بننا بنی نوع انسان کی خدمت کرنا ہے۔

"طلسم ہوشربا" سننے کے بعد انھیں کہانیوں اور کتابوں سے از حد دلچسپی ہوگئی انھوں نے اپنی اس دلچسپی کا ذکر "میری پہلی تخلیق" میں نہایت وضاحت سے کیا ہے، لکھتے ہیں:۔

"اس وقت میری عمر کوئی تیرہ سال ہوگی۔ ہندی بالکل نہ جانتا تھا۔ اردو کے ناول پڑھنے کا جنون تھا۔ مولانا شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا، مولوی محمد علی ہردوئی نواسی اس وقت کے مقبول ترین ناول نویس تھے، ان کی چیزیں یہاں مل جاتی تھیں۔ سکول کی یاد بھول جاتی تھی، کتاب ختم کر کے ہی دم لیتا تھا۔ اس زمانہ میں رینالڈ کے ناولوں کی دھوم تھی۔ اردو میں ان کے ترجمے دھڑا دھڑ نکل رہے تھے۔ اور ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے۔ میں بھی ان کا عاشق تھا۔ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار سے تو سیری نہ ہوتی تھی۔ ان کی تمام کتابیں میں نے پڑھ ڈالیں۔ ان دنوں میرے پتاجی گورکھپور میں رہتے تھے اور میں بھی گورکھپور کے سکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ جو تیسرا درجہ کہلاتا تھا۔ ریتی پر ایک کتب فروش بدھی لال رہتا تھا۔ میں اس کی دوکان پر جا بیٹھتا تھا۔ اس کے سٹاک سے ناول لے لے کر پڑھتا تھا۔ مگر دوکان پر سارے دن تو بیٹھ نہ سکتا تھا۔ اس لئے میں اس کی دوکان سے انگریزی کتابوں کی کنجیاں اور خلاصے لے کر اپنے سکول کے لڑکوں کے ہاتھ بیچا کرتا تھا اور اس کے معاوضہ میں ناول دوکان

سے گھر لا کر پڑھتا تھا۔ اور تین برسوں میں میں نے سیکڑوں ہی ناول پڑھ ڈالے ہوں گے۔ جب ناولوں کا سٹاک ختم ہو گیا تو میں نے نول کشور پریس سے نکلے ہوئے پرانوں کے اردو ترجمے بھی پڑھے اور "طلسم ہوشربا" کے کئی حصے بھی پڑھے۔ اس عظیم طلسمی کتاب کے ۱۷ حصے اس وقت تک نکل چکے تھے۔ اور ایک ایک حصہ بڑے سپر رائل کی شکل میں دو دو ہزار صفحات سے کم نہ ہوگا اور ان ۱۷ حصوں کے بعد اس کتاب کے مختلف موضوعات پر بیسیوں حصے چھپ چکے تھے۔ ان میں سے بھی میں نے کئی پڑھے۔ جس نے اتنے بڑے گرنتھ کی تخلیق کی اس کی قوت تخیل کس قدر زوردار ہوگی اس کا صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے، کہتے ہیں یہ کہانیاں مولانا فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے لئے فارسی میں لکھی تھیں۔ اس میں کس قدر صداقت ہے کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اتنی طویل کہانی شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں ہو۔ پوری انسائیکلو پیڈیا سمجھ لیجئے۔ ایک آدمی تو اپنی ساٹھ برس کی عمر میں نقل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ تخلیق تو دوسری بات ہے۔"

لیکن پڑھتے وقت دھنپت رائے ضرور سوچتے ہونگے کہیں بھی کوئی ایسی ہی معرکہ خیز تخلیق کروں اور اس خواہش سے ان کے تخیل کو جلا ملتی رہی۔

لیکن وہ صرف قصے کہانیاں ہی نہیں پڑھتے تھے۔ امتحان پاس کرنے کے لئے سکولی کتابوں پر بھی وقت صرف کرتے تھے لیکن ان کتابوں سے بیشتر دوسرے لڑکوں کی طرح انھیں چنداں رغبت نہیں تھی۔ طبیعت پر جبر کر کے پڑھتے تھے۔ اس لئے جو کچھ پڑھتے تھے اکثر بھول جاتے تھے۔ اپنے افسانہ "آخری حیلے" میں لکھتے ہیں۔

"میرا حافظہ بہت قوی نہیں۔ تاریخ دنیا کی ساری اہم تاریخیں فراموش ہو گئیں وہ ساری تاریخیں جو راتوں کو جاگ کر طبیعت پر جبر ڈال کر یاد کی تھیں۔"

اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھیں ہندسوں سے چڑھ تھی۔ وہ ریاضی میں کمزور واقع ہوئے تھے۔ دوسرے سکولوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے اس میں سنوات کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں یا پھر بادشاہوں، شہروں اور لڑائیوں کے نام گنوائے جاتے ہیں اور ان سے جو واقعات وابستہ کئے جاتے ہیں انھیں اسقدر توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے کہ ان میں کوئی ربط اور سلسلہ نہیں ہوتا کیونکہ اس طبقہ واری سماج میں تاریخ کو چند خودسر افراد یا بادشاہوں کا کھیل دکھانا مقصود ہوتا ہے۔ اس تاریخ کے متعلق پریم چند نے آگے چل کر اپنا نظریہ چند الفاظ میں بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ "میرے بہترین افسانے" کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"کہانی میں نام اور سنہ کے سوا باقی سب کچھ سچ ہے اور تاریخ میں نام اور سن کے سوا کچھ بھی حقیقت نہیں۔" اسی مضمون میں وہ لکھتے ہیں "ہماری روح کو عروجی قوت کہاں سے ملتی ہے؟ قوت تو مسلسل جد و جہد میں مصروف ہے ہمارا دل ... رکاوٹوں کو پھاند کر اپنے فطری مقام پر پہنچنے کی خواہش کرتا رہتا ہے۔ اسی جد و جہد سے تو ادب کی تخلیق ہوتی ہے ...۔"

دراصل تاریخ بھی ادب ہے کیونکہ آدمی نے اپنی بے سروسامانی کی حالت سے اس دور تک پہنچنے کے لئے جو جد و جہد کی ہے اور دنیا کو اس دور سے بھی بہتر اور حسین بنانے کے لئے اب بھی اس کی جد و جہد جاری ہے اور جاری رہے گی۔ تاریخ اس مسلسل جد و جہد کی کہانی ہے۔ اقتدار پسند طبقہ نے اپنے مفاد کے پیش نظر اس میں بیجا تصرف کیا ہے جس سے یہ کہانی مسخ ہو گئی ہے۔ اسے حقیقی اور دلچسپ بنانے کے لئے ازسرِ نو لکھنے کی ضرورت ہے۔ پھر اسے لڑکے بھی شوق سے پڑھیں گے۔ اور بعض ممالک میں طبقہ واری

سماج ختم ہوگیا ہے وہاں تاریخ کو اس ڈھنگ سے لکھا بھی گیا ہے کیونکہ انھیں انسانی جدوجہد کو اپنے فطری مقام کی طرف آگے بڑھانا مقصود ہے۔ روس اس سلسلہ میں دوسرے ممالک کی رہنمائی کر رہا ہے کیونکہ سب سے پہلے طبقہ واری سماج وہاں ختم ہوا ہے۔

چونکہ تاریخ کی سکولی کتاب میں روح کو گرمانے والی جدوجہد کا فقدان تھا۔ اور بےچارے دھنپت رائے روح کو گرما دینے والی محبت سے بھی محروم تھے "طلسم ہوشربا" کی کہانیاں پڑھنے کی طرف زیادہ مائل تھے۔ گو وہ طلسمی اور تخیلی نہیں لیکن ان میں روح کو گرما دینے والی حرارت موجود تھی کیونکہ بقول پریم چند "آج سے دو ہزار برس قبل یونان کے نامور فلاسفر افلاطون نے لکھا تھا کہ ہر تخیلی تخلیق میں بھی صداقت موجود ہے"

کہانیوں کے علاوہ روح کو گرمانے والے دوسرے مشغلے بھی تھے۔ دیہات کے گلی ڈنڈے کی جگہ شہر میں گیند نے لی تھی۔ "توبہ" کہانی میں لکھتے ہیں:

"جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو گیند کھیلتا تھا۔ اور ماسٹروں کی دھمکیاں سہتا تھا۔ یعنی میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ نہ عقل کا ظہور ہوا تھا نہ دانائی کی نشوونما۔"

"ستم ظریفی دیکھئے کہ اس عمر میں روایت پرست باپ نے بیٹے کی شادی کر دی۔ وہ متعلقہ حکام سے کہہ سن کر پھر اپنے گاؤں کے ڈاک خانہ میں تبدیل ہو گئے تھے اور دھنپت رائے پیدل چل کر بنارس پڑھنے جاتے تھے۔ وہ ابھی میٹرک پاس بھی نہیں کرنے پائے کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد پریم چند پر جو گذری اس کا ذکر انھوں نے بہت دلدوز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ خود نوشتہ سوانح حیات میں لکھتے ہیں۔

"میرا جنم سمت ۱۹۳۷ میں ہوا۔ والد ڈاک خانہ میں کلرک تھے۔ والدہ مریض تھیں ایک بڑی بہن تھیں۔ اس وقت والد شائد بیس روپے پاتے تھے۔ چالیس روپیہ تک

پہنچتے پہنچتے ان کا انتقال ہوگیا۔ یوں تو وہ بڑے دوراندیش محتاط اور دنیا میں آنکھیں کھول کر چلنے والے آدمی تھے۔ لیکن آخری عمر میں ٹھوکر کھا گئے۔ خود تو گرے ہی تھے اس دھکا میں مجھے بھی گرا دیا۔ پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے میری شادی کر دی۔ جس کے چند سال بعد ہی انھیں سفر آخرت درپیش ہوگیا اس وقت میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ گھر میں میری بیوی، سوتیلی ماں اور ان کے دو لڑکے تھے۔ مگر آمدنی ایک پیسہ کی نہ تھی۔ گھر میں جو کچھ تھا چھ ماہ تک والد کی علالت اور اس کے بعد تجہیز و تکفین میں خرچ ہوگیا۔ مجھے ایم۔ اے پاس کرنے کا ارمان تھا۔ سرکاری ملازمت اس زمانہ میں بھی اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کر کے دس بارہ روپے کی جگہ پا جاتا، مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دھن تھی۔ مگر پاؤں میں لوہے کی نہیں اشٹ دھات کی بیڑیاں پڑی ہوتی تھیں۔ اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا۔

آگے پڑھنے کی دھن میں تعلیم جاری رکھی اور اسکول جانے کا نقشہ اس مضمون میں یوں پیش کیا ہے:۔

"پاؤں میں جوتے نہ تھے، بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے۔ گرانی الگ، دس سیر کے جَو تھے۔ اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی۔ کوئینس کالج بنارس میں پڑھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف کر دی تھی۔ امتحان سر پر تھا۔ اور میں بانس کے پھاٹک پر ایک لڑکے کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ چار بجے شام کو پہنچ جاتا اور چھ بجے چھٹی پاتا تھا۔ وہاں سے میرا گھر پانچ میل پر تھا۔

تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے رات سے پہلے نہ پہنچ سکتا۔ سویرے پھر آٹھ بجے گھر سے چل دیتا۔ ورنہ وقت پر اسکول نہ پہنچتا۔ رات کو کھانا کھا کر کپّی کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ معلوم کب سو جاتا۔"

درس گاہ

دل پر جتنا گہرا صدمہ ہوتا ہے اپنے ردِ عمل
کی صورت میں اتنا ہی مؤثر ہوتا ہے - -

(پریم چند)

جو کی روٹیاں کھا کر اور پھٹے حالوں رہ کر دھنپت رائے نے میٹرک تو پاس کر لیا لیکن ان کی منزل تھی ایم - اے پاس کرنا اور وکیل بننا - بے سروسامانی کی حالت میں بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری - اپنی اس منزل کو حاصل کرنے کے لئے بہت کوشش کی بہت پاپڑ بیلے - لیکن پھر بھی ناکام رہنا پڑا - اپنی اس ناکامی کا ذکر پریم چند نے خود کیا ہے اور بڑے دردناک پیرایہ میں کیا ہے - - -

"میٹرکولیشن تو کسی طرح پاس ہو گیا - لیکن سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا ، اور کوئنس کالج میں داخلہ کی کوئی امید نہ رہی - فیس صرف اول درجہ میں پاس ہونے

والوں کی معاف ہو سکتی تھی۔ خوش قسمتی سے اس سال ہندو کالج کھل گیا تھا۔ میں نے اس نئے کالج میں پڑھنے کا ارادہ کیا۔ مسٹر رچرڈسن پرنسپل تھے۔ ان کے مکان پر گیا وہ سر سے پاؤں تک ہندوستانی لباس میں ملبوس تھے۔ اور دھوتی پہنے فرش پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے لیکن مزاج تبدیل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ میری گذارش سن کر (ابھی میں آدھی ہی بات کہہ پایا تھا) بولے کہ گھر پر میں کالج کی بات نہیں سنتا۔ ناچار کالج گیا۔ ملاقات تو ہوئی۔ مگر ناامیدی کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب کیا کروں۔ اگر کسی کی سفارش لے آتا تو شاید میری درخواست پر غور ہوتا لیکن ایک دیہاتی لڑکے کو شہر میں جانتا ہی کون تھا۔

روز گھر سے اس ارادہ سے نکلتا کہ کہیں سے سفارش لکھا لاؤں۔ لیکن بارہ میل کی منزل مار کر شام کو یوں ہی گھر واپس آجاتا۔ شہر میں کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ تھا۔

کئی دنوں کے بعد ایک سفارش ملی۔ ایک صاحب ٹھاکر اندر نارائن سنگھ ہندو کالج کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ ان سے جا کر رویا انھیں مجھ پر رحم آیا۔ اور انھوں نے سفارشی چٹھی لکھ دی۔ اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ بہر حال۔ خوش خوش گھر آیا۔ دوسرے دن پرنسپل صاحب سے ملنے کا ارادہ تھا۔ لیکن گھر پہنچتے ہی مجھے بخار آگیا۔ اور دو ہفتے سے پہلے نہ ٹلا۔ نیم کا کاڑھا پیتے پیتے ناک میں دم آگیا۔ ایک دن دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کہ میرے پروہت جی آگئے۔ میری حالت دیکھ کر مزاج پرسی کی اور فوراً کسی کھیت سے ایک جڑ کھود لائے اور اسے دھو کر سات دانے کالی مرچ کے ساتھ پسوا کر مجھے پلا دیا۔ اس نے جادو کا اثر کیا۔ بخار چڑھنے میں گھنٹے

بھر کی دیر تھی ۔ مگر دوا نے گویا گھنٹے بھر کے اندر ہی اس کا گلا گھونٹ دیا ۔ میں نے پنڈت جی سے بار بار اس جڑی کا نام پوچھا مگر انھوں نے نہ بتایا ۔ کہا نام بتانے سے اس کا اثر جاتا رہے گا ۔

غرض ایک مہینہ کے بعد دوبارہ مسٹر ہچ ڈسن سے ملا ۔ اور انھیں ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط دکھلایا ۔ انھوں نے میری طرف گھور کر دیکھتے ہوتے پوچھا :۔

"اتنے دنوں تک کہاں تھے ؟"

"بیمار ہو گیا تھا"

"کیا بیماری تھی ؟"

میں اس سوال کے لئے تیار نہ تھا ۔ اگر بخار بتاتا تو شائد صاحب مجھے جھوٹا سمجھیں بخار میری سمجھ میں معمولی بات تھی ۔ جس کے لئے اتنی لمبی غیر حاضری کی ضرورت نہ تھی ۔ کوئی ایسی بیماری بتانے کی فکر ہوئی ۔ جو مجبوری اور تکلیف کے علاوہ رحم کے جذبات کو بھی ابھار سکے ۔ اس وقت مجھے اور کسی بیماری کا نام یاد نہ آیا ۔ ٹھاکر اندر نارائن سنگھ سے جب میں سفارش کے لئے ملا تھا تو انھوں نے اپنے اختلاج قلب کے مرض کا ذکر کیا تھا ۔ ان کے الفاظ مجھے یاد آ گئے میں نے کہا ۔ پلپٹیشن آف ہارٹ سر ۔

PULPSTATION OF HEART SIR

صاحب نے متعجب ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا اب تم بالکل اچھے ہو ؟

"جی ہاں" ۔

"اچھا فارم داخلہ بھر کر لاؤ"

میں نے سمجھا چلو بیڑا پار ہوا ، فارم لیا ، خانہ پری کی اور پیش کر دیا ۔ صاحب

اس وقت کسی کلاس میں پڑھا رہے تھے۔ تین بجے مجھے فارم واپس ملا۔ اس پر لکھا تھا۔
"اس کی لیاقت کی جانچ کی جائے"۔

یہ نیا مرحلہ پیش آیا تو میرا دل بیٹھ گیا۔ انگریزی کے سوا اور کسی مضمون میں پاس ہونے کی امید نہ تھی۔ اور حساب و ریاضی سے تو میری روح کانپتی تھی۔ جو کچھ یاد تھا وہ بھی بھول گیا تھا۔ اب کوئی دوسری صورت کیا ہو سکتی تھی۔ تقدیر پر بھروسہ کر کے کلاس میں گیا اور اپنا فارم دکھایا۔ پروفیسر صاحب بنگالی تھے انگریزی پڑھا رہے تھے۔ واشنگٹن ارونگ کا رِپ وین رنکل RIP VAN WRINKLE کا سبق تھا۔ میں پیچھے کی قطار میں جا کر بیٹھ گیا۔ اور دو ہی چار منٹ میں مجھے معلوم ہو گیا کہ پروفیسر صاحب اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہیں۔ گھنٹہ ختم ہونے پر انھوں نے آج کے سبق پر مجھ سے مختلف سوالات کئے۔ اور میرے جوابات سن کر میری عرضی پر "اطمینان بخش" کا لفظ لکھ دیا۔

دوسرا گھنٹہ حساب کا تھا اس کے پروفیسر بھی بنگالی تھے میں نے اپنا فارم دکھایا نئی درسگاہوں میں عموماً وہی طلبا آتے ہیں جنھیں کہیں جگہ نہیں ملتی۔ یہاں بھی یہی حال تھا۔ کلاسوں میں کم استعداد اور نا قابل طلبا بھرے پڑے تھے۔ پہلے ریلے میں جو آیا وہ بھرتی ہو گیا۔ بھوک میں ساگ پات بھی لذیذ معلوم ہوتا ہے۔ مگر اب پیٹ بھر گیا تھا۔ طلبا چُن چُن کر لئے جاتے تھے۔ پروفیسر صاحب نے حساب میں میرا امتحان لیا۔ اور میں فیل ہو گیا، فارم پر حساب کے خانہ میں "نا قابل اطمینان" لکھ دیا۔

میں اتنا نا امید ہوا کہ فارم لے کر دوبارہ پرنسپل کے پاس نہ گیا۔ سیدھا گھر چلا آیا۔ حساب میرے لئے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں حساب

دلو مرتبہ فیل ہوا۔ اور نا امید ہو کر امتحان دینا چھوڑ دیا۔ دس بارہ سال کے بعد جب ریاضی کا مضمون اختیاری ہوگیا۔ میں نے دوسرے سبجکٹ لے کر آسانی سے انٹرمیڈیٹ پاس کرلیا۔ اس وقت تک ریاضی کی بدولت صدہا طلباء کی آرزوؤں کا خون ہوا۔ خیر میں نا امید ہو کر گھر لوٹ آیا۔ لیکن پڑھنے کی تمنا باقی ہی رہی۔ گھر بیٹھ کر کیا کرتا۔ کسی طرح حساب پختہ کر کے پھر کالج میں داخل ہو جاؤں گا۔ یہی دھن تھی مگر اس کے لئے شہر میں رہنا ضروری تھا۔ اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھانیکا کام مل گیا۔ پانچ روپیہ تنخواہ ٹھہری۔ میں نے دو روپیہ میں گذارہ کر کے تین روپیہ گھر دینے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ وکیل صاحب کے اصطبل کے اوپر ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری تھی۔ اس میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھالیا۔ بازار سے ایک چھوٹا سا لیمپ لے آیا۔ اور شہر میں رہنے لگا۔ گھر سے کچھ برتن بھی لایا۔ ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور دھو مانج کر گھر چلا جاتا۔ حساب تو بہانہ تھا۔ ناول وغیرہ پڑھا کرتا پنڈت رتن ناتھ در کا "افسانہ آزاد" انھیں دنوں پڑھا۔ "چندر کانتا سنتتی" بھی پڑھا بنکم بابو کے اردو ترجمے بھی جتنے لائبریری میں تھے سب پڑھ ڈالے۔ جن وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا ان کے سالے میٹریکولیشن میں میرے ساتھ پڑھتے تھے انھیں کی سفارش سے مجھے یہ ٹیوشن ملا تھا۔ اس دوستی کی وجہ سے جب ضرورت ہوتی ان سے پیسہ ادھار لیا کرتا اور تنخواہ ملنے پر حساب بیباق کر دیتا۔ کبھی دو روپے ہاتھ آتے کبھی تین۔ جس دن تنخواہ کے دو تین روپے ملتے میری قوت ارادی کی باگ ڈھیلی ہو جاتی۔ للچائی ہوئی آنکھیں حلوائی کی دوکان کی طرف کھنچ لے جاتیں اور دو تین آنے کے پیسے ختم کئے بغیر واپس نہ آتا۔ پھر اسی دن گھر جاتا اور دو ڈھائی روپے دے آتا

دوسرے دن سے پھر ادھار لینا شروع کر دیتا۔ لیکن کبھی کبھی ادھار لینے میں پس و پیش بھی ہوتا۔ جس کی وجہ سے سارا دن روزہ رکھنا پڑتا۔

اس طرح چار پانچ مہینے گذر گئے۔ اس درمیان ایک بزاز سے دو ڈھائی روپے کے کپڑے ادھار لئے تھے روز ادھر سے نکلنا ہوتا تھا۔ اس کا مجھ پر پورا بھروسہ تھا۔ جب مہینے دو مہینے ہو گئے اور میں پیسے نہ چکا سکا۔ تو پھر میں نے اُدھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ چکر دے کر نکل جاتا۔ تین سال میں اس کے روپے ادا کر سکا۔ اسی زمانہ میں شہر کا ایک بیلدار مجھ سے کچھ ہندی پڑھنے آیا کرتا تھا۔ اس کا گھر وکیل صاحب کے مکان کی پشت پر تھا۔ "جان لو۔ بھیّا" اس کا سخن تکیہ تھا۔ چنانچہ سب لوگ اسے "جان لو بھیّا" ہی کہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے آٹھ آنے کے پیسے ادھار لئے تھے یہ پیسے اس نے مجھ سے میرے گاؤں میں جا کر پانچ برس کے بعد وصول کئے۔ اب بھی میری پڑھنے کی خواہش تھی۔ لیکن روز بروز نا امید ہوتا جاتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہیں نوکری مل جائے تو کر لوں۔ لیکن نوکری کس طرح اور کہاں ملتی ہے، یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

جاڑے کا موسم تھا مگر کوڑی پاس نہ تھی۔ دو دن تک تو ایک ایک پیسے کے بھنے ہوئے چنے کھا کر کاٹے۔ میرے مہاجن نے ادھار دینے سے انکار کر دیا۔ اور میں لحاظ کے مارے کسی سے مانگ نہ سکتا تھا۔ چراغ جل چکے تھے۔ اس وقت میں ایک بک سیلر کی دوکان پر ایک کتاب بیچنے گیا۔ پروفیسر چکرورتی کی بنائی ہوئی ارتھمیٹک کی شرح تھی۔ جو میں نے دو سال ہوئے خریدی تھی۔ اب تک اسے بڑی احتیاط سے رکھا تھا لیکن آج جب چاروں طرف سے مایوس ہو گیا تو اسے فروخت کرنے کا ارادہ تھا۔ کتاب کی قیمت دو روپے تھی۔ لیکن ایک روپیہ میں سودا ہوا۔ میں روپیہ لے کر دوکان

سے اترا ہی تھا کہ لمبی مونچھوں والے ایک متین شخص نے مجھ سے پوچھا۔

"تم یہاں کہاں پڑھتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "پڑھتا تو کہیں نہیں۔۔۔۔ پر کہیں نام لکھانے کی فکر میں ہوں"۔

"میٹریکولیشن پاس ہو؟"

"جی ہاں"

"نوکری تو نہیں چاہتے؟"

"نوکری کہیں ملتی نہیں"۔

یہ بھلے مانس کسی چھوٹے سے سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور انھیں ایک اسسٹنٹ ماسٹر کی ضرورت تھی۔ اٹھارہ روپے تنخواہ پر مجھے ملازم رکھ لیا۔ اس وقت اٹھارہ روپے میری مایوس تمنا کی معراج تھے۔ میں دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس حاضر ہونے کا وعدہ کر کے چلا تو پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ یہ ۱۸۹۹ء کی بات ہے۔ میں گرد و پیش کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ اور اگر ریاضی کی وجہ سے اٹک نہ جاتا تو ضرور آگے تک جاتا۔ مگر ریاضی نے سارے ارمان خاک میں ملا دیئے"

دھنپت رائے نے بیشک یہی سمجھا ہوگا کہ ارمان ریاضی نے خاک میں ملائے اور یکایک نوکری مل جانے سے وہ قسمت کے قائل بھی ہو گئے تھے۔ ہو جانا ضروری تھا۔ کیونکہ اندھے افلاس کا قسمت ہی ایک سہارا ہے۔

لیکن بعدازاں جب ساری زندگی ہی ارمان خاک میں ملتے رہے اور پریم چند بن کر بھی ناموافق حالات میں مرضی کے خلاف کام کرنا پڑا تو معلوم ہوا کہ ارمان خاک میں ملانے والی قوتیں بہت زبردست ہیں جو ریاضی کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں

اوران سے لڑنا ضروری ہے۔ پانچ سو صفحے کا ناول "گئودان" انھی ارمانوں کے خاک میں ملنے کی کہانی ہے۔ ہوری کی ناکامیاں پریم چند کی اپنی ناکامیاں ہیں۔ اس ناول میں انھوں نے ایک فقرہ لکھا ہے جو سارے ناول کا نچوڑ ہے اور دھنپت رائے کی اس کیفیت کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ لکھا ہے:-

"زندگی کی ٹریجڈی اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ کا دل جو کام نہیں کرنا چاہتا وہ آپ کو کرنا پڑے۔"

اس ٹریجڈی کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے اس زمانہ کے حالات مختصر سے مضمون میں کافی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ مگر ان کی زندگی کی یہ تصویر ابھی ادھوری ہے۔ گھر پر سوتیلی ماں تھی۔ اسے وہ چاچی کہتے تھے۔ خاوند کی موت سے ان کے ارمان بھی خاک میں ملے تھے۔ دھنپت رائے کی اپنی بیوی تھی جب شوہر یوں کس مپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا تھا تو اس نوجوان عورت کے ارمان بھی خاک میں مل رہے تھے۔ اس کی بابت پریم چند نے براہِ راست کچھ نہیں لکھا۔ لیکن وہ اس کی زندگی کا حصّہ تھے۔ وہ اس کے ارمانوں کا خون ہوتے دیکھیں اور محسوس نہ کریں ممکن نہیں تھا۔ باپ کی موت کے بعد سوتیلی ماں کے جذبات "علیحدگی" کہانی میں بخوبی بیان کئے ہیں۔ لیکن کہانی سوانح حیات نہیں۔ اپنی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہوئے بھی کہانی کے تقاضہ کے مطابق اس میں کچھ ردّ و بدل کرنا پڑتا ہے۔ نام ہی مختلف نہیں ہوتے زیبِ داستان کے لئے ماحول بھی ذرا بدل دیا جاتا ہے۔ واقعات اور افراد ان کے وہی نہیں ہوتے۔ لیکن ان کی تہ میں کار فرما حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔ اس لئے جزئیات کی بجائے حقیقت پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

لکھتے ہیں "۔ پتا کے پانچ بچے تھے۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ اتنا بڑا خرچ اور کمانے والا کوئی نہیں۔ رگھو اب کیوں بات پوچھنے لگا۔۔۔ اپنی بیوی لائے گا اور الگ رہے گا۔ پتا کو چاروں طرف اندھیرا نظر آتا تھا۔ مگر کچھ بھی ہو وہ رگھو کی دست نگر بن کر گھر میں نہ رہے گی جس گھر میں اس نے راج کیا اس میں اب لونڈی نہ بنے گی جس لونڈے کو اپنا غلام سمجھا اس کا منہ نہ تکے گی وہ حسین تھی۔ ابھی اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس کا حسن ابھی پوری بہار پر تھا۔ وہ کوئی دوسرا گھر کرے گی۔ یہی ہوگا نہ لوگ ہنسیں گے۔ ہنسنے دو۔۔۔۔ رگھو کی ذلیل بن کر کیوں رہوں۔

بھولا کو مرے ایک مہینہ گذر گیا تھا شام ہو گئی۔ پتا اسی تشویش میں پڑی ہوئی تھی کہ یکایک اسے خیال آیا لڑکے گھر میں نہیں ہیں۔ بیلوں کے آنے کا وقت ہے کہیں راستے میں نہ پڑ جائیں۔ اب دروازہ پر کون ہے جو ان کی نگرانی کرے گا۔ رگھو تو یہی چاہے گا کہ نہ بچتے ہوں تو کچل جائیں۔ میرے لڑکے تو اسے پھوٹی آنکھوں نہیں بھاتے۔ کبھی ہنس کر نہیں بولتا۔ گھر سے باہر نکلی تو دیکھا۔ رگھو سامنے جھونپڑے میں بیٹھا اوکھر کی گنڈیریاں بنا رہا ہے۔ تینوں لڑکے اس کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور چھوٹی لڑکی اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے۔ اس کی پیٹھ پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ ماں کو آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ آج تو یہ نئی بات ہے۔ شاید دنیا کو دکھاتا ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو کتنا چاہتا ہوں۔ اور من میں چھری رکھی ہوئی پر گھات ملے تو جان ہی لے لے۔ کالا سانپ ہے۔ کالا سانپ۔ تند لہجہ میں بولی۔ تم سب کے سب وہاں کیا کرتے ہو۔ گھر میں آؤ۔ سانجھ کی بیرا ہے گورے آتے ہوں گے۔

رگھو نے التجا کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ میں تو ہوں کاکی اور کس بات کا۔
بڑا لڑکا کیدار بولا۔ کاکی۔ رگھو دادا نے آج ہمارے لئے دو گاڑیاں بنا دی ہیں
یہ دیکھو ایک پر ہم اور کھنو بیٹھیں گے۔ دوسری پر لچھمن اور جھنیا دادا دونوں گاڑیاں
کھینچیں گے۔

یہ کہہ کر وہ ایک کونے سے دو چھوٹی چھوٹی گاڑیاں نکال لایا۔ چار چار پہیے
لگے ہوئے تھے۔ بیٹھنے کے لئے تختے تھے۔ اور روک کے لئے دونوں طرف بازو لگے ہوئے تھے۔

پنا نے تعجب سے پوچھا۔ گاڑیاں کس نے بنائیں؟
کیدار نے چڑھ چڑھ کر کہا۔ رگھو دادا نے بنائیں اور کس نے۔ بھگت کے گھر سے
بسولا اور کھانی مانگ لائے۔ اور جھٹ پٹ بنا دیں۔ خوب دوڑتی ہے کاکی۔
بیٹھو کھنو میں کھینچوں۔

کھنو گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کیدار کھینچنے لگا۔ چر چر کا شور ہوا۔ گویا گاڑی
بھی اس کھیل میں لڑکوں کے ساتھ شریک ہے۔ لچھمن نے دوسری گاڑی میں بیٹھ کر
کہا دادا کھینچو۔

رگھو نے جھنیا کو بھی گاڑی میں بٹھا دیا۔ اور گاڑی کھینچتا ہوا دوڑا۔ تینوں
لڑکے تالیاں بجانے لگے۔ پنا تعجب انگیز نظروں سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی اور سوچ
رہی تھی یہ وہی رگھو ہے یا کوئی اور۔"

دراصل یہ پریم چند کا اپنا کردار ہے۔ یہ بے لوث شرافت ان کے وجود
کے رگ رگ میں ایسی رچی ہے جس کا ثبوت صرف رگھو نے ہی نہیں "منتر" کہانی کا بوڑھا
بھگت بھی دیتا ہے۔ اور "حج اکبر" "مہاتیرتھ" کی غریب دایہ بھی ہے۔

دھنپت رائے نے بھی انھی دیہاتیوں کے درمیان رہ کر پرورش پائی تھی چنانچہ یہ شرافت اس کی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ اور اس کی بدولت پریم چند اس نتیجہ پر پہنچے تھے۔

"کسان پورا سوارتھی ہوتا ہے اس میں شبہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس کی ساری زندگی قدرت کا پورا ساتھ دیتے ہوئے گذرتی ہے۔ پیڑوں میں پھل لگتے ہیں جنھیں سب کھاتے ہیں۔ بادل سے پانی برستا ہے جس سے زمین آسودہ ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسے حالات میں مذموم خود غرضی کی گنجائش کہاں؟ ہوری کسان تھا اور کسی کے جلتے ہوئے گھر میں ہاتھ سینکنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔"

(گئو دان)

اسی ناول میں دوسری جگہ تحریر کیا ہے؟ ۔ "سبھی حقیقی انسانوں میں ترک و ایثار کا جذبہ چھپا رہتا ہے اور روشنی پاکر چمک اٹھتا ہے۔"

دھنپت رائے نے بھی فطرت کے مناظر سے اپنی روح کو آسودہ کیا تھا۔ اور روشنی میں رہ کر زندگی بسر کی تھی۔ اس لئے اس میں یہ جذبہ خود بخود پرورش پاتا رہا۔ چمکتا ہی رہا۔ کبھی مدھم نہیں ہوا۔ وہ سوتیلی ماں اور اس کے بیٹوں کی امداد ہمیشہ کرتے رہے۔ سوتیلی ماں اپنے چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لائی تھی۔ جو وہیں رہتا اور پلتا تھا۔ جب ٹیوشن میں صرف پانچ روپے پاتے تھے تو ڈھائی روپے گھر دے آتے تھے اور جب اٹھارہ روپے کی ملازمت ملی تو بھی نصف یا اس سے بھی زیادہ گھر بھیجتے رہے یہ بچت کرتے وقت انھیں کتنی دقت ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ "مستعار گھڑی" کہانی کے ہیرو کی مشکلات سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو اپنے دوست کی کھوئی ہوئی گھڑی

کی قیمت چکا دینے کے لئے اپنا جگر کاٹ کر قلیل تنخواہ میں سے ہر مہینے نصف روپے بچاتا ہے۔

دھنپت رائے مونچھوں والے متین اور شریف آدمی کے طفیل سے ماسٹر ہو گئے۔ اب وہاں کیسے رہتے سہتے ہیں اس کا نقشہ "مستعار گھڑی" میں یوں کھینچا ہے۔

"دوسرے دن ایک بہت سستے ہوٹل میں اُٹھ گیا۔ ہوٹل تو نام تھا۔ تھا وہ ایک چڑیا خانہ۔ بارہ روپے میں انتظام ہو گیا۔ ۱۰ کھانے کے اور دو مکان کے۔ ناشتہ کے لئے دودھ اور چائے کی جگہ ایک آنے کے چنے لا کر رکھ دیئے۔ اوپر کے مصارف کے لئے تین روپے رکھ دیئے۔ صاف ۱۵ بچ گئے۔ سخت نفس کشی تھی۔ تپسیا سمجھو۔ نہ پان، نہ سگریٹ، نہ چاٹ، نہ مٹھائی، نہ لیمونیڈ، نہ برف نہ کسی کے ہاں آنا جانا۔ پورا سنیاس تھا۔ خواہشیں بار بار اٹھتی تھیں۔ لیکن حباب کی مانند اپنی بے بضاعتی کے احساس سے بیٹھ جاتی تھیں۔ جب میں نے مہینہ کے آخر میں ۱۵ روپے لے کر دانو کو دیئے تو ایسا معلوم ہوا کہ میرا سر کچھ اونچا ہو گیا ہے۔ میں کئی انگل لمبا ہو گیا ہوں۔ ایسی پرغرور مسرت اپنی زندگی میں مجھے کبھی نہ نصیب ہوئی تھی۔

یہ کئی انگل لمبا ہو جانے والا شخص دھنپت رائے ہے۔ جس نے ۱۵ نہیں تو کم از کم لو دس روپے منی آرڈر سے یا کسی دوسرے طریقہ سے گھر بھیجے ہیں۔ گھڑی کھو جانے کا تو محض بہانہ ہے۔ جو آدمی دکھا دے کے لئے گھڑی کھو دے اور اسے مجبوراً اس کی قیمت ادا کرنی پڑے وہ ایسی پرغرور مسرت محسوس نہیں کر سکتا۔ یہ

تو پریم چند کا اپنا ایثار ہے ۔ اور روپے بھیج دینے کے بعد کی کیفیات کا جائزہ اس طرح لیا ہے :۔

"یہاں سے لوٹا تو مجھے اپنے دل میں ایک نئی قوت ایک مردانہ حوصلہ کا احساس ہو رہا تھا ۔ وہ بے دلی جو دل پر مسلط رہتی تھی غائب ہو گئی"۔

"مزاج میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہونے لگی ۔ جن خواہشات کا روکنا میرے لئے امر محال تھا ۔ ان کی طرف اب میرا خیال بھی نہ جاتا تھا ۔ جس پان کی دوکان پر اپنا دل بے قرار ہو جاتا تھا ۔ اس طرف سے اب میں یوں سر اُٹھائے نکل جاتا تھا ۔ گویا پان کھانا زنانوں کا کام ہو ۔ میرے لئے سخت معیوب ۔ سگریٹ، چائے چاٹ کسی چیز کی طرف دل مائل نہ ہوتا تھا ۔ صبح کو بھیگے ہوئے چنے ۔ دونوں وقت روٹی اور دال ۔ بس اس کے سوا میرے لئے دنیا کی سب چیزیں ممنوع تھیں ۔ میں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا ۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مجھے اب زندگی سے خاص الفت ہو گئی تھی ۔ افلاس موت کو دعوت کہاں سے دیتا ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں زندگی میں کچھ کر سکتا ہوں"۔

"لاٹری" کہانی کے ان الفاظ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے ۔ لکھتے ہیں اور "میرے پاس بھی روپے نہ تھے ۔ میں اسکول میں ماسٹر تھا ۔ بیس روپے ملتے تھے ۔ دس گھر بھیج دیتا تھا ۔ دس میں لشتم پشتم اپنا گذارہ کرتا تھا ۔ ایسی حالت میں پانچ روپے کا ٹکٹ خریدنا میرے لئے مشکل ہی نہیں محال تھا"۔

ادھر پریم چند گھر والوں کے لئے ایثار کر کے لاثانی عظمت سے روشناس ہو رہے تھے ۔ اُدھر ان کی بیوی کا رویہ بالکل مختلف تھا ۔ اس کے رویہ کی وضاحت کے لئے

ہم پھر "علاحدگی" کہانی کی طرف لوٹتے ہیں۔ پنّا کے کہنے سننے سے رگھو نے باپ کی موت کے تھوڑے عرصہ بعد شادی کر لی تھی۔ اس کی بیوی مُلیا کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"مُلیا میکے ہی سے شمشیر برہنہ آئی تھی۔ میرا شوہر چھاتی پھاڑ کر کام کرے اور پنّا رانی بنی بیٹھی رہیں۔ ان کے لڑکے رئیس زادے بنے گھومیں۔ مُلیا سے یہ برداشت نہ ہوگا۔ وہ کسی کی غلامی نہ کرے گی۔ اپنے لڑکے تو اپنے ہوتے نہیں۔ بھائی کس کے ہوتے ہیں۔ جب تک پر نہیں نکلے ہیں۔ بھائی کو گھیرے ہوتے ہیں۔ یوں ہی ذرا سیانے ہوئے پر جھاڑ کر نکل جائیں گے۔ بات بھی نہ پوچھیں گے۔

ایک دن اس نے رگھو سے کہا۔ تم نے اس طرح گلا کسی کرنی ہو تو کرو مجھ سے تو نہ ہوگی۔

رگھو:۔ تو پھر کیا کروں۔ تو ہی بتا۔ لڑکے ابھی گھر کا کام کرنے کے لائق بھی تو نہیں ہیں۔

مُلیا:۔ لڑکے راوت کے ہیں۔ کچھ تمہارے تو نہیں ہیں۔ یہی پنّا ہیں جو تمہیں دانہ دانہ کو ترساتی تھیں۔ سب سن چکی ہوں۔ میں لونڈی بن کر نہ رہوں گی۔ روپے پیسے کا مجھے کچھ حساب نہیں ملتا۔ نہ جانے تم کیا لاتے ہو۔ اور وہ کیا کرتی ہیں۔ ڈھائی سو کا گڑ بکا۔ روپے کہاں گئے۔ مجھے دیکھنے کو بھی نہ ملے۔ تم سمجھتے ہو روپے گھر ہی میں تو ہیں۔ مگر دیکھ لینا جو تمھیں ایک پھوٹی کوڑی بھی ملے۔

رگھو:۔ تو گھر کی مالکن بن جائے گی تو دنیا کیا کہے گی۔ یہ تو سوچ۔

مُلیا:۔ دنیا جو چاہے کہے۔ دنیا کے ہاتھوں بکی نہیں ہوں۔ دیکھ لینا۔ بھاڑ لیپ کر ہاتھ کالا ہی رہے گا۔ پھر تم اپنی ماں اور بھائی بہنوں کے لئے مرو۔ میں

کیوں مروں؟

لیکن پریم چند نے اپنا رویّہ نہیں بدلا وہ خود تنگدست رہ کر... بھی تاعمر سوتیلی ماں اور بھائیوں کی امداد کرتے رہے۔

سکول ماسٹر

وہ مبارک اوقات جن سے زندگی کے نئے
دور کا آغاز ہوتا ہے ہمارے جذبات میں
خلوص اور اعتماد پیدا کر دیتے ہیں ۔۔ (پریم چند)

اب پریم چند سکول ماسٹر تھے مگر وہ اس سے مطمئن نہیں تھے ۔ کیونکہ انھوں نے ملازمت دل سے قبول نہیں کی تھی ناسازگار حالات نے زبردستی اس طرف دھکیل دیا ۔ تعلیم ادھوری رہ جانے کی پھانس دل میں اٹکی ہوئی تھی ۔ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اس زندگی سے چھٹکارا چاہتے تھے ۔ لیکن ہیڈ ماسٹر شریف تھا ۔ اس نے سمجھا بجھا کر انھیں اس کام پر لگا رکھا ۔ پریم چند نے اپنی کہانی "ہولی کی چھٹی" میں شروع کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے ۔

" ورنیکلر فائنل پاس کرنے کے بعد مجھے ایک پرائمری مدرسے میں جگہ مل گئی ۔ جو

میرے گھر سے گیارہ میل پر تھا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر کو تعطیلوں میں بھی لڑکوں کو
پڑھانے کا خبط تھا۔۔۔۔ اپریل میں سالانہ امتحان ہونے والا تھا۔ اس لئے جنوری
ہی سے ہائے توبہ مچی ہوئی ہے۔ نائب مدرسوں پر اتنی عنایت تھی کہ رات کی کلاسوں
میں انھیں نہ طلب کیا جاتا تھا۔ مگر تعطیل بالکل نہ ملتی تھی۔ سوموتی اماوس آئی اور
نکل گئی۔ شیوراتری آئی اور چلی گئی۔۔۔۔ اس نے مجھے کئی مہینوں سے گھر جانے کا
موقع نہ ملا تھا۔ مگر اب کے میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ہولی پر ضرور گھر جاؤں گا۔
چاہے نوکری سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑیں۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے ہی ہیڈ ماسٹر صاحب
کو الٹی میٹم دیدیا کہ ۲۰ مارچ کو ہولی کی تعطیل شروع ہوگی اور بندہ ۱۹ کی شام کو
رخصت ہو جائیگا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ ابھی لڑکے ہو تمھیں کیا معلوم
نوکری کتنی مشکلوں سے ملتی ہے۔ اور کتنی مشکلوں سے چلتی ہے۔ نوکری پانا اتنا
مشکل نہیں جتنا کہ اس کا نبھانا۔ اپریل میں امتحان ہونے والا ہے۔ تین چار دن مدرسہ
بند رہا۔ تو بتاؤ کتنے لڑکے پاس ہوں گے۔ سال بھر کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔
کہ نہیں۔ میرا کہنا مانو۔ اس تعطیل میں نہ جاؤ۔ امتحان کے بعد جو تعطیل پڑے اس میں
چلے جانا۔ ایسٹر کی چار دن کی تعطیل ہوگی۔ میں ایک دن کے لئے بھی نہ روکوں گا۔ میں
اپنے مورچہ پر قائم رہا۔ فہمائش اور تخویف کسی اسلحہ کا مجھ پر اثر نہ ہوا۔ ۱۹ کو جونہی مدرسہ
بند ہوا۔ میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو سلام بھی نہ کیا۔ اور چپکے سے اپنی جائے قیام پر
چلا آیا۔ انھیں سلام کرنے جاتا تو وہ ایک نہ ایک کام نکال کر مجھے روک لیتے۔ رجسٹر
میں فیس کی میزان لگاتے جاؤ۔ اوسط حاضری نکالتے جاؤ۔ لڑکوں کی مشقی کاپیاں
جمع کر کے ان پر اصلاح اور تاریخ سب مکمل کر دو۔ گویا یہ میرا آخری سفر ہے اور مجھے زندگی

کے سارے کام بھی ختم کر دینے چاہئیں"۔

اس اقتباس میں پریم چند نے مدرّس کے ایسے کام گنوائے ہیں جن سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس سے اچھا اور بہتر کام کرنا چاہتے تھے۔ مشقی کاپیوں کی اصلاح کرنے کی بجائے ایم۔اے۔پاس کرکے وکیل بننا چاہتے تھے۔ اگر یہ نہیں ہو سکا تو وہ یہاں کیوں جھک مارتے رہیں۔ نوکری سے اکتا دینے والی دوسری بات تھی۔ قلیل تنخواہ جس کا انھیں بے حد رنج تھا۔ لکھتے ہیں:-

"پنڈت چندر دھر نے ایک اپر پرائمری مدرسہ میں مدرسی تو کر لی تھی۔ مگر ہمیشہ پچھتایا کرتے تھے کہ ناحق اس جنجال میں آ پھنسے۔ اگر کسی اور صیغہ میں ہوتے تو اب تک ہاتھ میں چار پیسے ہوتے۔ آرام سے زندگی بسر ہوتی۔ یہاں مہینہ بھر کے انتظار کے بعد کہیں پندرہ روپے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ اِدھر آئے اُدھر غائب۔ نہ کھانے کا سکھ نہ پہننے کا آرام"۔

کھانے پہننے کا آرام نہ ہوتے ہوئے بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ انھیں سوتیلی ماں اور بھائیوں کی امداد کرکے یہ تسکین حاصل ہوتی تھی کہ میں بھی دنیا میں کچھ کر سکتا ہوں دوسرے ہیڈ ماسٹر شریف اور روادار تھا۔ اس لئے نوکری نبھاتے رہے۔ مگر ایم۔اے پاس کرنے کا ارمان خلش بن کر دل میں کھٹکتا رہا۔ اور انھوں نے ذہنی طور پر ماحول کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ اپنی ایک کہانی "لال فیتے" میں لکھتے ہیں۔

"مگر میری بلاس کا شوق طلب اس کرن اور روزی سے مستغنی تھا۔ اس عزم قوی کے ساتھ جو اکثر نادار طلباء کا مایہ امتیاز ہے۔ وہ کالج میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ وہ ایک دو رئیس زادوں کے لڑکے پڑھا کر تعلیم مصارف نکال لیا کرتا تھا۔ مگر وقتاً فوقتاً اسے

یک مشت رقموں کی ضرورت ہوتی تھی۔"

پریم چند آگے پڑھنے کی کیا کیا سکیمیں سوچتے تھے اور انھیں کون کونسی مشکلات نظر آتی تھیں۔ یہ اقتباس ان کا ایک عکس ہے۔ اور ہری بلاس خود انھیں کا نمائندہ ہے جو خارجی حالات کے خلاف ان تھک جدوجہد جاری رکھتا ہے۔ وہ کسی صورت بھی شکست قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ آخر اس کے عزم قوی کو کامرانی نصیب ہوتی ہے۔ یہی ہری بلاس ہمیں پھر "شکست کی فتح" کہانی میں نظر آتا ہے۔ اس وقت وہ پڑھائی کے تمام مدارج طے کر چکا ہے۔ کالج میں پروفیسر ہے۔ اور خوشحال زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کی بابت بجیاری کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:۔

"بابوجی نے محض اپنی محنت اور کوشش سے پرائیویٹ ٹیوشن کر کے یہ درجہ حاصل کیا ہے۔"

پریم چند کو خوشحال زندگی بسر کرنا ساری عمر نصیب نہیں ہوا۔ لیکن وہ اپنے لئے اور ہندوستانی عوام کے لئے ہمیشہ خوشحال زندگی کے خواب دیکھتے رہے۔ اور اپنے ان خوابوں کو حقیقت میں ڈھالنے کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ انھوں نے اس پرائمری سکول کی مدرسی کرتے ہوئے دو مرتبہ انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا۔ اور دونوں مرتبہ ریاضی کے باعث فیل ہو گئے۔

لیکن تعلیم جاری رکھنے کی جلد ہی ایک دوسری صورت پیدا ہو گئی۔ دو تین سال کی سروس کے بعد پرائمری سکول کے مدرسوں کو سرکاری طور پر ٹریننگ دی جاتی تھی۔ چنانچہ پریم چند بھی سنہ ۱۹۰۵ء میں ٹریننگ کالج الٰہ آباد میں داخل ہو گئے۔

پریم چند کے ایک ہم سبق بابو کرشن لال نے "زمانہ" کانپور پریم چند نمبر میں

میں اس دور کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے -

"پریپریٹری کلاس (PREPRATORY CLASS) میں داخل ہوتے انٹرنس پاس امیدوار ایک سال اسی کلاس میں تعلیم پاتے تھے اور دوسرے سال جونیر کلاس میں۔ اس وقت صوبہ ہذا میں یہی ایک ٹریننگ کالج تھا۔ جونیر سینیر کے سپیشل ٹیچرز ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے - اس کے پرنسپل ہر دلعزیز مسٹر کیمپلسٹر مرحوم اپنے شاگردوں کے سچے بہی خواہ تھے اور مددگار تھے۔ یہاں سے ۱۹۰۵ء میں مرحوم جونیر کلاس کا امتحان درجہ اول میں پاس کرکے جونیر سرٹیفکیٹڈ J . C ٹیچر کی سند لے کر نکلے - - - -

پرنسپل صاحب آپ سے بہت خوش تھے۔ اس لئے انھوں نے آپ کو ٹریننگ کالج کے ماڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں راقم الحروف بھی ٹریننگ کالج سینیر کلاس میں زیر تعلیم تھا - ہم سب لوگ یعنی مدرسانِ مڈل سکول کالج ہوسٹل میں رہتے تھے - اسکو روحانی کشش سمجھنا چاہئیے کہ میرا منشی صاحب سے خاص طور پر تعارف ہوا اور بہت جلد دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے - آپ طبعًا بڑے غیور اور ذہین واقع ہوئے تھے"

ہندوستان میں جو انگریز آتے تھے چونکہ وہ حکمراں طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے پریم چند ان سے نفرت کرتے تھے - کہیں بھی اچھے الفاظ میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن اپنی سہیلی کی چھٹی "کہانی میں ایک انگریز کا ذکر بڑے پیار سے کیا ہے - لکھتے ہیں:-

"مسٹر جینکس سے کئی بار مل چکا ہوں اس کی شرافت نے مجھے اس کا عقیدت مند بنا دیا ہے میں اسے انسان نہیں فرشتہ سمجھتا ہوں"

یہ فرشتہ سیرت انگریز غالباً ٹریننگ کالج کا پرنسپل ہی تھا جو اپنے شاگردوں کا سچا بہی خواہ تھا اس نے پریم چند کے دل میں پڑھنے اور آگے بڑھنے کی تحریک پیدا کی۔ ان کے اس دور کے متعلق کچھ روشنی منشی دیا نارائن نگم ایڈیٹر زمانہ نے بھی ڈالی ہے انھوں نے لکھا ہے :۔

"انھوں نے اپریل سنہ ۱۹۰۴ء میں جونیر انگلش ٹیچرس سرٹیفکیٹ کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا۔ اس کے سرٹیفکیٹ مورخہ یکم جولائی سنہ ۱۹۰۵ء میں جس پر مسٹر جے۔ سی کمپسٹر پرنسپل اور مسٹر بیکن انسپکٹر مدراس الہ آباد سرکل کے دستخط ہیں عبارت ذیل قابل ذکر ہے۔ NOT QUALIFIED TO TEACH MATHEMATICS CONDUCT SATISFACTORY AND REGULAR. HE WORKED EARNESTLY AND WELL.

(یعنی ممتحن نے اس سرٹیفکیٹ میں صاف لکھ دیا ہے کہ ریاضی پڑھانے کی قابلیت نہیں ہے۔ مگر چال چلن قابل اطمینان رہا۔ اور وہ پابند اوقات بھی رہے اور اپنا کام جانفشانی اور خوبی سے کیا۔)

سنہ ۱۹۰۷ء میں قدیم الہ آباد یونیورسٹی کا اسپیشل ورنیکلر امتحان بھی اردو اور ہندی دونوں میں پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان کئی بار دیا۔ لیکن ہر دفعہ ریاضی میں ناکامیاب رہے۔ آخر جب یہ مضمون لازمی نہیں رہا اور اختیاری ہو گیا تو سنہ ۱۹۱۰ء میں سیکنڈ ڈویژن میں اسکو بھی پاس کر لیا۔ اس وقت وہ گورنمنٹ اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں ان کے مضامین تھے ۔

انگریزی۔ منطق۔ فارسی اور زمانہ حال کی تاریخ۔

نو سال کے بعد ۱۹۱۹ء میں جب گورکھپور میں ٹیچر تھے تو الہ آباد یونیورسٹی کا امتحان بی۔ اے بھی سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس مرتبہ ان کے سبجکٹ یہ تھے۔ انگریزی۔ فارسی۔ اور تاریخ"

امتحان تو انھوں نے ضرور پاس کئے لیکن وہ امتحان پاس کرنے کے لئے نہیں پڑھتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم زندگی کی تکمیل کا ذریعہ تھی۔ اس لئے پڑھنے کے لئے امتحان پاس کرتے تھے۔ اور پڑھنے کی لگن کا اندازہ ان کے ... ایک چھوٹے سے اقتباس سے چلتا ہے۔ اپنی "فلسفی کی محبت" کہانی میں لکھتے ہیں :۔

"لالہ گوپی ناتھ کی طبیعت دور شباب ہی سے فلسفہ کی جانب مائل تھی وہ انٹرمیڈیٹ کلاس ہی میں تھے کہ مل اور برکلے ان کے لوگ زبان ہو گئے تھے"

بابو کرشن لال نے اپنے مضمون کو جاری رکھتے ہوئے لکھا ہے :۔

"منشی پریم چند ابتدا ہی سے کتب بینی کے بہت شائق تھے۔ چنانچہ ایک روز میرے ساتھ مسٹر سچدانند سنہا بیرسٹر سے ملاقات کی تاکہ وقتاً فوقتاً ان کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ ایک مرتبہ انھیں سے مولوی ذکاء اللہ صاحب کی تاریخ ہند لے آئے۔ اور چند ہی روز میں اس کی نینوں یا چار دں ضخیم جلدوں کو ختم کر ڈالا اور اس غور سے پڑھا جیسے اس پر کوئی تنقیدی مضمون لکھنا ہے"

آگے لکھتے ہیں۔

"جس طرح ان کی وضع قطع سادہ تھی۔ عادتیں اور اخلاق بھی سیدھا سچا اور تصنع سے بالاتر تھا۔ خلوص آپ کا ہمیشہ سے شعار تھا۔ آواز بلند تھی اور خواہ مخواہ

کسی سے دبنے والے آدمی نہ تھے۔ ہوسٹل میں کسی سے لڑنا جھگڑنا درکنار انھیں کبھی کسی سے نا ملائم یا خلافِ تہذیب گفتگو کرتے ہوتے بھی نہیں دیکھا گیا۔ ملازموں کے ساتھ بھی اچھی طرح پیش آتے تھے۔

"پڑھتے لکھتے وقت اکثر اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا کرتے اور تفریح کے وقت دل کھول کر تفریح کرتے ۔ ۔ ۔ ۔"

فراق گورکھپوری نے بھی ان کے شوق مطالعہ پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"پریم چند کسی خاص اصول کے ماتحت کبھی کتابیں نہیں پڑھا کرتے تھے اور انھیں زیادہ تر انھیں کتابوں اور ناولوں سے دلچسپی ہوتی تھی جو رسم و رواج و روایات تاریخی واقعات اور زندگی کے دوسرے نقوش سادہ اور مانوس طریقہ پر پیش کرتی تھیں۔ اس میں وہ اپنے طلب و تحقیق اور ذوقِ ادب کا پتہ بھی دیتے تھے"

مرزا فدا علی خنجر لکھنوی نول کشور پریس لکھنؤ میں ان کے رفیقِ کار رہ چکے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"وہ پرانی کہانیوں اور قصوں کے بے انتہا شائق تھے۔ اکثر راقم الحروف سے فرمائش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی ان کے مذاق کے مطابق چھوٹی موٹی کتاب مل جاتی تو میں اسے ان کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ وہ خوش ہو جاتے اور نہایت ذوق سے پڑھتے۔ جب واپس کرنے لگتے تو اس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتے۔ یہ خیالات ان کی ناقدانہ قوت کا مظہر تھے"

ٹریننگ کالج کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہیں انھیں ماڈل اسکول

کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا۔ لڑکے انھیں ماسٹر دھنپت رائے اور احباب بابو دھنپت رائے کہتے تھے۔ لڑکپن چلا گیا تھا۔ زندگی اور ماحول سے اچھی طرح مانوس ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ مدرسی کرتے ہوئے بھی ان کے لئے آگے بڑھنے کا امکان ہے۔ چنانچہ "میدان عمل" کا ہیرا امرکانت کہتا ہے :-

"میں اب تک فضول تعلیم کے پیچھے پڑا رہا سکول اور کالج سے الگ رہ کر بھی آدمی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے"

[illegible]

پہلی تخلیق

لکھتے تو وہ ہیں جن کے دل میں کچھ درد ہے
پریم ہے، لگن ہے، اور گیان ہے۔ جنھوں نے
دولت کو زندگی کا مقصد بنالیا ہے وہ کیا لکھیں گے؟
(پریم چند)

تعلیم مافی الضمیر کو ادا کر سکنے کی تربیت حاصل کرنے کا نام ہے۔ پریم چند نے یہ بات ابتدا ہی سے محسوس کرلی تھی اس لئے وہ اتنی مستعدی سے تعلیم کے پیچھے پڑے ہوتے تھے۔ اسی لئے وہ کتابوں کو اتنے غور سے پڑھتے تھے اور ان پر دوستوں سے بحث و تمحیص کرتے تھے۔ اس تنقیدی شعور کے باعث ان میں ابھی رفتہ رفتہ لکھنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔

انھیں قصے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا ہی، اور یہ شوق ہمیشہ بڑھتا رہا کیونکہ

یہ قصے کہانیاں ان کی بے کیف اور بے رنگ و بو زندگی میں رومان اور رنگ بھرتی تھیں "طلسم ہوشربا" اور "چندر کانت سنتتی" کے تخیلی کردار خارجی واقعات کے خلاف جدوجہد کرنے پر آمادہ کرتے تھے، قوتِ عمل کو محرک رکھتے تھے اور ان کے رگ و پے میں جو حرارت پوشیدہ تھی اسے شعلہ گیر بنا دیتے تھے اس سے ان کے ذہن پر ادب کی افادیت نقش ہو گئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے زمانہ کا بہت کچھ سرد و گرم دیکھا تھا اور حالات نے انھیں حساس و غیور بنا دیا تھا۔ ان کے دل میں بے پایاں جذبات موجزن رہتے تھے۔ انھیں زندگی سے انس تھا۔ اور وہ ہمیشہ سوچتے تھے کہ دنیا میں میں بھی کچھ کر سکتا ہوں۔ مگر خارجی واقعات ان کے ارمانوں کو کچل رہے تھے۔ زندگی میں جو ناکامیاں ہوتی تھیں انھیں کامرانیوں میں تبدیل کرنے اور ناآسودہ تمناؤں کے اظہار کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ تخلیق و تصنیف کی راہ اپنائیں۔ چنانچہ اظہار پر عبور حاصل کرتے ہی انھوں نے قصے کہانیاں لکھنا شروع کر دیا۔

انھوں نے کہانیاں کب سے لکھنا شروع کیں۔ اس کے لئے کوئی دوسری سند درکار نہیں۔ خود ان کا اپنا بیان موجود ہے۔ لکھتے ہیں:-

"پہلے پہل ۱۹۰۷ء میں میں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی میں نے کئی کہانیاں انگریزی میں پڑھی تھیں، ان میں سے بعض کا ترجمہ کیا اور پہلا ناول تو میں نے ۱۹۰۱ء میں لکھنا شروع کیا۔ میرا ایک ناول ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا اور دوسرا ۱۹۰۴ء میں -- لیکن کہانیاں سب سے پہلے ۱۹۰۷ء ہی میں لکھیں۔ میری پہلی کہانی کا نام تھا "دنیا کا سب سے انمول رتن" وہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ زمانہ میں چھپی۔ اس کے بعد میں نے زمانہ میں چار پانچ کہانیاں اور لکھیں

لیکن "زمانہ کانپور" میں انھوں نے اس سے بھی پہلے لکھنا شروع کر دیا تھا۔۔

منشی دیانارائن نگم ایڈیٹر زمانہ لکھتے ہیں :۔

"سال بھر کے اندر ہی اندر پریم چند جی سے جن کا اصلی نام دھنپت رائے تھا خط و کتابت شروع ہو گئی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۴ء کے آخر تک وہ بھی زمانہ کے قلمی معاونین میں شامل ہو گئے ۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے آپ نے سب سے پہلے ایک تنقیدی مضمون ۱۹۰۵ء میں "زمانہ" میں شائع ہونے کے لئے اور ایک ناول کا مسودہ بغرض مشورہ بھیجا تھا۔"

۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء میں جو دو ناول شائع ہوئے تھے ان کے نام غالباً "کرشنا" اور "ہم خرما اور ہم ثواب" تھے ۔ مگر منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی کا کہنا ہے کہ ان کا پہلا ناول پریما ہے جو ہندی میں شائع ہوا تھا اور اردو میں اس کا نام پرتاب چندر ہے یہ دھنپت رائے کے نام سے شائع ہوئے ہیں ۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا پہلا ناول "ہم خرما و ہم ثواب" تھا ۔

بہر کیف منشی پریم چند نے کہانیوں سے پہلے ناول لکھنا شروع کیا ۔ لیکن ان کی ادبی زندگی کا آغاز اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا ۔ جو کہانیاں آدمی دل میں سوچتا ہے لیکن لکھ نہیں سکتا ۔ وہ بھی تو ذہن پر اپنا اثر چھوڑتی ہیں ۔ اور قوتِ تخلیق کو آگے بڑھاتی ہیں اور ایسی کہانیاں بھی ہوں گی جو منشی پریم چند نے لکھی تو سہی لیکن شائع نہیں ہوئیں ۔ "میری پہلی تخلیق" میں انھوں نے ایک ایسی ہی تحریر کا ذکر کیا ہے :۔

ایک مزاحیہ ڈرامہ تھا جو انھوں نے اپنے ماموں کے متعلق لکھا تھا ۔

ان کے ماموں گاؤں میں رہتے تھے ۔ موروثی زمین تھی ۔ اس سے کھانے بھر کو

آجاتا تھا لیکن مجرّد زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔ سماجی رکاوٹوں کے باعث شادی
نہیں ہوسکی۔ اس لئے ایک چماری سے جو ان کے گھر میں گوبر پاتھنے اور کوڑا کرکٹ
اٹھانے آیا کرتی تھی عشق لڑانے لگے۔ چماری چالاک تھی اس نے سماج کے مظلوم
اس آدمی کی کمزوری کو بھانپ لیا۔ ادھر اس سے اچھے اچھے کپڑے لیتی اور تر مال
کھاتی رہی اور ادھر اس عشق کا چرچا چمار بستی میں کر دیا۔ اس لئے جس روز ماموں
صاحب کو اس عشق کا آخری مرحلہ طے کرنا تھا ان کی خوب مرمّت ہوئی۔ چماری کے
اندر آتے ہی یوں ہی انھوں نے سانکل لگائی کہ لٹھ بند چماروں نے دروازہ توڑنا
شروع کر دیا۔ وہ خوف کے مارے بھوسے والے کمرے میں جا چھپے۔ مگر چمار اپنی
سی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ انھیں اندر سے نکال کر خوب پیٹا۔

سارے گاؤں میں ان کی کھلی اڑی اور وہاں رہنا مشکل ہو گیا اس لئے
وہ بہنوئی کے گھر اٹھ آئے۔ اس سے پہلے بھی جب کبھی اکیلے رہتے جی گھبرا جاتا تھا اکثر
آجاتے تھے۔ پریم چند کی عمر اس وقت بارہ تیرہ سال تھی۔ وہ ان پر ہمیشہ رعب
گانٹھا کرتے تھے۔ پریم چند کا خیال تھا کہ اس واقعہ کے بعد ماموں صاحب کا رویّہ
نرم پڑ جائے گا لیکن جب دیکھا کہ ایسا نہیں ماموں صاحب بدستور رعب گانٹھ رہے
ہیں تو انھوں نے اس واقعہ کی بنا پر ایک مزاحیہ ڈرامہ لکھا جس میں چماروں کے
ہاتھوں ماموں کی مرمّت کا ذکر خوب مزے لے لے کر کیا تھا۔

وہ صبح سکول جاتے وقت یہ ڈرامہ ماموں صاحب کے سرہانے رکھ گئے
چھٹی ملنے پر وہ یہ خیال دل میں لئے لوٹ رہے تھے کہ دیکھیں ڈرامہ پڑھنے کے بعد ان
پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا۔ لیکن گھر پہنچے تو وہاں نہ ماموں موجود تھے۔ اور نہ وہ ڈرامہ

شاید وہ جاتے وقت ان کی "پہلی تخلیق" کو نذر آتش کر گئے تھے۔

اس سے پریم چند کے افتادِ طبع کا پتہ چلتا ہے وہ بڑے ہو کر ہمیشہ سوشل برائیوں پر چوٹ کرتے رہے۔ اس کے بعد جب ان کی عمر چودہ سال تھی انھوں نے ایک ڈرامہ اور لکھا جس کا نام تھا "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" یہ نام لطف سے خالی نہیں ان کی ذات پر صادق آتا ہے۔ چار سال بعد ایک ناول "اسرارِ محبت" "آوازِ خلق" میں شائع ہوا تھا۔ یہ اخبار بنارس سے نکلتا تھا۔

پریم چند کے شروع کے ناول اور افسانے ہر نئے ادیب کی تصنیفات کی طرح فنی اعتبار سے اچھے نہیں تھے۔ ان کی عبارت اپنے پیشروؤں کی طرح مقفع اور پر تکلف تھی اس پر "قصۂ چہار درویش" اور رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" کا رنگ غالب تھا۔

سید علی جواد زیدی نے منشی پریم چند پر ایک بسیط مضمون میں ان کے اسلوب کی بابت لکھا ہے "جتنے بڑے بڑے لکھنے والے ہیں۔ وہ سب اس کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایک انفرادی حیثیت حاصل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر منشی پریم چند کی تصانیف کو اس نقطۂ نظر سے نہ دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ یہ تمام افسانے ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے نہیں بلکہ مختلف مصنفین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں کہیں سرشار کا رنگ نظر آئے گا۔ کہیں کِشن نارائن در کا اور کہیں رابندر ناتھ ٹیگور کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پریم چند کا یہ عقیدہ تھا کہ عبارت اور خیالات میں حتی الوسع ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ جس قسم کے خیالات کا وہ اظہار کرنا چاہتے تھے اس کے لئے ویسے ہی طرزِ ادا کا انتخاب بھی کرتے تھے۔"

ہر ایک ادیب اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں سے متاثر ہوتا ہے اور پہلے پہل

انہی کے رنگ میں لکھتا ہے۔ اسلوب میں انفرادیت پیدا کرنے کے لئے تو ایک عرصہ
درکار ہے اور اس کے لئے مسلسل اور شعوری کوشش کرنا پڑتی ہے۔ منشی پریم چند
کو بھی اس بات کا پورا احساس تھا۔ ایڈیٹر زمانہ لکھتے ہیں :-

"۱۹۱۴ء تک وہ اپنے طرزِ تحریر کے متعلق دبدھے میں تھے۔ چنانچہ ۴ مارچ ۱۹۱۴ء
کا خط ان کے دلی خیالات کا آئینہ ہے لکھتے ہیں :- "مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں
ہوا کہ کون سا طرزِ تحریر اختیار کروں۔ کبھی تو بنکم[۵۱] کی نقل کرتا ہوں۔ کبھی آزاد[۵۲] کے پیچھے
چلتا ہوں۔ آج کل ٹالسٹائی کے قصے پڑھ چکا ہوں۔ تب سے کچھ اسی رنگ کی طرف
طبیعت مائل ہے۔ یہ اپنی کمزوری ہے۔ اور کیا۔ یہ قصہ جو میں روانہ کر رہا ہوں۔
اس میں لطفِ تحریر کی مطلق کوشش نہیں کی گئی۔ سیدھی سادی باتیں لکھی ہیں۔
معلوم نہیں آپ پسند کریں گے یا نہیں"

وہ قصہ کیا تھا معلوم نہیں۔ لیکن اتنی بات صاف ہے کہ وہ مقفیٰ اور پر تکلف
عبارت آرائی سے رفتہ رفتہ سادہ اور بے ساختہ طرزِ تحریر کی طرف آتے گئے۔ پریم
پچیسی اور پریم بتیسی اور پریم چالیسی کی کہانیوں میں جو زورِ بیان ہے وہ بعد کی
کہانیوں میں نہیں رہا۔ بعد میں وہ سادہ مگر زیادہ پر اثر اور دلکش ہو گیا۔ دونوں
عبارتوں کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

"جاہ اور ثروت، کمال اور شہرت یہ سب سفلی اور مادی ہیں۔ نفس کی ناز برداری
اس قابل نہیں کہ ہم ان کے سامنے فرقِ نیاز جھکائیں۔ ترک اور تسلیم ہی وہ علوی
صفات ہیں جن کے آستانہ پر حشمت اور جاہ سے بے نیاز سر بھی جھک جاتے ہیں۔ یہ
وہی طاقت ہے جو جاہ و حشم کو بادۂ غرور کے متوالوں کو اور تاج مرصع کو اپنے قدموں

پر گرا سکتی ہے۔"   (پریم بتیسی حصہ اوّل، کہانی سرِ غرور)

اور یہ ایک دوسرا ٹکڑا بعد کی کہانیوں سے درج کیا جاتا ہے۔

"لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے ہم زندہ ہیں مستعد ہیں۔ میدان سے ہٹے نہیں۔ ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔ یہ دکھا دینا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبۂ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں ہم اس نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ جس کی بنیاد خود غرضی اور خون چوسنے پر رکھی ہوئی ہے۔"

(کتاب زادِ راہ، کہانی آشیاں برباد)

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پریم چالیسی کے بعد زبان یک لخت بدل گئی بلکہ پریم پچیسی میں جو زبان ہے۔ پریم بتیسی میں اس سے آسان ہے اور پریم چالیسی میں پریم بتیسی سے آسان ہو گئی ہے۔ اور بعض کہانیوں میں اس کے بعد بھی زبان مشکل ملتی ہے۔ مثلاً بعد کی کہانیاں " خاک پروانہ" "فکر دنیا" اور "بڑے بالو" خاک پروانہ نام کے مجموعہ میں درج ہیں ان کی زبان کافی مشکل ہے جس کا سبب کہانیوں کا موضوع ہے اور اس کے برعکس ان کے مقابلہ میں پریم بتیسی حصہ اول کی کہانی "پنچایت کی زبان کافی آسان ہے۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"گھنٹہ بھر کے بعد جمن شیخ الگو چودھری کے پاس آئے اور ان کے گلے سے لپٹ کر بولے "بھیا جب سے تم نے میری پنچائت کی ہے میں دل سے تمہارا جانی دشمن تھا۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ پنچائت کی سند پر بیٹھ کر نہ کوئی کسی کا دوست ہوتا ہے اور نہ دشمن انصاف کے سوا اور اسے کچھ نہیں سوجھتا۔"

ظاہر ہے کہ موضوع اسلوب پر اثر انداز ہوتا ہے منشی پریم چند جوں جوں عوام کے قریب آئے ان کی طرزِ تحریر صاف اور عام فہم ہوتی گئی۔ جب انھوں نے انگو اور ہری دھن یا شیخ جمن کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا تو ان کی زبان بھی اپنانا ضروری تھی۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ "گئو دان" میں انھوں نے بہت ہی آسان زبان استعمال کی ہے۔ اور اس سے پہلے "پریم آشرم" کی زبان بھی ہندی اور اردو دونوں میں سمجھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ کسانوں یعنی عام لوگوں کی زبان ہے۔

شروع میں جب وہ طلسمی کہانیوں کی زبان استعمال کرتے تھے تو ان کی اپنی کہانیاں بھی ایک طرح طلسمی ہوتی تھیں اور ان میں ما فوق الفطرت واقعات کی بھرمار رہتی تھی۔ ان کا پلاٹ بھی پریوں کی کہانی کی طرح عجیب اور واقعات کی بھرما سے پُر ہوتا تھا۔ مثلاً ان کی ایک کہانی "نیک بختی کے تازیانے" ہے اس کا پلاٹ یہ ہے کہ رائے بھولا ناتھ لکھنؤ کے بہت بڑے رئیس ہیں۔ ننھوا نامی ایک لڑکا ان کا ملازم ہے جو ان کی کمسن لڑکی رتنا کے کمرے کی صفائی کرتا ہے اور کبھی کبھی اس کے ساتھ کھیلتا بھی ہے۔ ایک دن ننھوا کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ رتنا کے پلنگ پر جا در تان کر سو گیا۔ رائے صاحب نے کہیں اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گئے اور کوڑے مار مار کر غریب ننھوا کی چمڑی اُدھیڑ دی۔

اس کے بعد واقعات یوں چلتے ہیں کہ ننھوا بھنگیوں کی ایک بستی میں جا کر رہنے لگا وہاں گانا بجانا سیکھا اور اتنا ماہر ہو گیا کہ گوالیار کی ایک موسیقی کانفرنس میں اپنی قابلیت کا لوہا منایا اور سکول میں داخل ہو گیا۔ وہاں سے موسیقی کی سب سے اونچی سند حاصل کی اور اپنے استاد کے ساتھ یورپ کے سفر پر چلا گیا۔ وہاں

مغربی موسیقی میں دسترس حاصل کی اور لوٹ کر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا۔ اب اسے عالمگیر شہرت حاصل تھی اور ہر جگہ سواگت ہوتا تھا وہ لکھنؤ بھی آیا۔ رتنا نے پھول مالا پہنائی اور آخر رائے بھولا ناتھ نے اپنی لڑکی رتنا کی شادی نتھورام میوزک ماسٹر سے کر دی۔

گویا یہ بھی شکست کی فتح تھی۔ منشی پریم چند کو زندگی میں جن شکستوں سے دوچار ہونا پڑا تھا انھیں وہ تخیل کے زور سے فتح میں تبدیل کر رہے تھے اور اپنی کہانیوں کے ذریعہ اپنی ـــــ آدمی کی جدوجہد کو آگے بڑھا رہے تھے۔

بعد میں بھی ان کی کہانیوں اور ناولوں میں مافوق الفطرت واقعات اکثر آتے ہیں اور وہ انھیں شعوری طور پر لاتے ہیں اور ان کے لئے جواز پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایڈیٹر "زمانہ" نے ایک واقعہ تحریر کیا ہے :-

"مکرمی عبداللہ یوسف علی صاحب نے ۱۹۱۸ء میں لکھا تھا کہ پریم چند سے میری طرف سے کہہ دیجئے کہ میں ان کی طرزِ تحریر کا بڑا مدّاح ہوں۔ لیکن انھیں ایسے قصّے اور ناول لکھنا چاہیئے جن سے قومی جذبات کی نشوونما میں مدد ملے اور فوق العادت واقعات سے پاک ہوں۔ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ "مسٹر عبداللہ کی رائے پر عمل کروں گا۔ حالانکہ SUPER NATURAL ELEMENT آدمی کی زندگی میں شامل ہے۔

بیشک مافوق الفطرت عناصر آدمی کو گھٹی میں ملے ہیں۔ وہ بہت ہی عجیب و غریب خواب دیکھتا ہے اور خواب دیکھنا اس کے لئے مفید بھی ہے۔ "الف لیلا" کے انسان نے جو محلات الٰہ دین کے چراغ کی مدد سے بنائے تھے وہ اب اس نے اپنی

محنت اور کوشش سے زمین پر تعمیر کرتے ہیں۔ وہ ابھی پریوں کی داستانوں کی طرح تختِ سلیمان یا جادو کے کھٹولے پر نہیں اڑتا اس نے سچ مچ ہوائی جہاز ایجاد کر لیا ہے۔

منشی پریم چند نے خارجی حالات کی یورشوں سے روح کو محفوظ رکھنے کے لئے مافوق العادت واقعات کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔ لیکن اس کے متعلق بھی وہ ایک متحرک نظریہ رکھتے تھے۔

"کہانیاں تو اس وقت پیدا ہوئیں جب آدمی نے بولنا سیکھا۔ لیکن قدیم افسانوی ادب کا ہمیں جو کچھ علم ہے۔ اس کے لئے الف لیلا السیپ کی کہانیاں اور کتھا سرت ساگر کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ اس وقت کے ادب کے معیاری کارنامے ہیں۔ ان کا واحد حسن اور معیار ان کا افسانوی تحیّر اور تخیل ہے۔ آدمی کو عجیب اور انوکھی چیزوں سے ہمیشہ محبت رہی ہے۔ نئی اور عجیب و غریب چیزوں کو سن کر آج بھی وہ اپنے باپ دادا کی طرح خوش ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ عوام آج الف لیلا کی کہانیوں سے جس قدر محظوظ ہوتے ہیں اتنا جدید ناولوں سے نہیں ہوتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر بھی بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عالموں اور فن کاروں نے فن کی تشہیر کے لئے جو معیار تخلیق کئے ہیں، ان سے فن کا حسن اور بھی بڑھ گیا ہے، فطرت میں جو فن ہے وہ فطرت کا ہی ہے، آدمی کا نہیں، آدمی کو تو محض وہی آرٹ اچھا لگتا ہے جس پر اس کی سوچ کی مہر ثبت ہو، جو گیلی لکڑی کی مانند آدمی کے ذہنی سانچے میں ڈھل کر اس کے مطابق ہو جائے۔ ۔ ۔"

(دیباچہ، میرے بہترین افسانے بنارس اگست ۱۹۳۳ء)

اسی دیباچہ میں اپنے اس نظریہ کی مزید وضاحت کی ہے۔

"پرانے قصّے کہانیاں واقعاتی تحیّر کی دلچسپی سے دلکش ضرور ہیں۔ لیکن ان میں اس رس کی کمی ہے جو پڑھے لکھے لوگ ادب میں کھوجتے ہیں۔ اب ہمارے قارئین کچھ ترقی پسند ہو گئے ہیں۔ وہ دوسری صنعتوں کی مانند ادب میں بھی جدّت اور تنوّع تلاش کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اب ہم کسی راجہ کی غیر معمولی بہادری یا رانی کا ہوا کے دوش پر اُڑ کر راجہ کے قریب پہنچنے یا جنوں بھوتوں کے من گھڑت قصوں سے خوش نہیں ہوتے۔ ہم انھیں موزوں کانٹے پر تولتے ہیں اور ذرا بھی وزن میں کم ہونے پر قبول نہیں کرتے۔ آج کے افسانے اور ناول میں غیر فطری باتوں کی گنجائش نہیں ان میں ہم اپنی زندگی کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے ایک ایک فقرہ اور ہر کردار کو حقیقت کے جامہ میں دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ اس میں جو کچھ بھی لکھا جائے وہ اس طرح ہو کہ معمولی ذہانت کا آدمی بھی اسے حقیقت تصور کرے۔ جو کچھ فطری ہے وہ حقیقت ہے اور فطرت سے پرے ہٹنے پر آرٹ اپنی خوبصورتی اور حلاوت کھو دیتا ہے اسے دو چار فن کار ہی سمجھ سکتے ہیں۔ عوام کے ذہن پر چھانے کی صلاحیت اس میں نہیں رہتی۔"

پریم چند نے بھی جب عوام کے زیادہ قریب ہو کر عوام کے لئے لکھا تو ان کی کہانیوں اور ناولوں میں مافوق العادت واقعات نہیں رہے، ویسے "نصیحت کے تازیانے" کہانی پریوں کی کہانی سے مشابہ ضرور ہے لیکن ہیرو ورتنا کے پلنگ تک پہنچنے کے لئے جو کوشش کرتا ہے اور اسے جو واقعات درپیش آتے ہیں وہ عجیب اور کسی

قدرے تحیر انگیز ضرور ہیں لیکن غیر فطری نہیں ہیں۔

دراصل کہانی کا جنم آدمی کے شوقِ طلب سے ہوا ہے۔ دنیا کے ابتدا میں اس نے سوچا کہ بادل کیوں گرجتا ہے؟ بھونچال کیوں آتا ہے؟ اور اس کے محدود ذہن اور تخیل نے اس "کیوں" کا جو جواب دیا وہ کہانی بن گیا۔ جوں جوں اس کا علم اور تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ کہانی میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ یعنی کہانی کی اصل اس کی تفصیل نہیں بلکہ آدمی کا تجسّس ہے۔ پریم چند نے یہی بات اپنی ایک کہانی کے ہیرو کے بارے میں لکھی ہے۔ "اس کے مضامین میں طول کم اور تفتیش زیادہ ہوتی ہے۔"

پریم چند کی کہانیوں کی بنیاد بھی تفتیش ہے۔

کانپور میں

ہم عالمگیر وسیع عظمت کا ایک جزو ہیں۔ جز میں
کل کا وصف ہونا لازمی ہے اس لئے شہرت اور
عزت روحانی ترقی اور تعلیم کی طرف ہمارا فطری رجحان ہے

(پریم چند)

ٹریننگ کالج الہ آباد کے ماڈل سکول سے تبدیل ہو کر پریم چند سنہ ۱۹۰۵ء میں
کانپور آگئے اور یہیں سے دراصل ان کی ادبی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ منشی
دیانارائن نگم ایڈیٹر زمانہ سے پہلے ہی ان کی راہ و رسم ہو گئی تھی کیونکہ سنہ ۱۹۰۴ء میں
انھوں نے اپنا ایک تنقیدی مضمون "زمانہ" میں شائع کرایا تھا اور نگم صاحب سے
خط و کتابت شروع ہو گئی تھی۔

منشی دیانارائن نگم بہت ہی شریف اور نیک واقع ہوئے تھے اور نہایت۔

خلوص اور محنت کے ساتھ زمانہ کی ایڈیٹری کے فرائض ادا کر رہے تھے وہ سمجھتے تھے
کہ ایڈیٹر کا فرض ادب کو سنوارنا اور وسعت دینا ہے۔ جہاں اسے پڑھنے والوں
کا حلقہ وسیع کرنا ہوتا ہے وہاں نئے اور ہونہار ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی اس کا
فرض ہے وہ اپنے اس فرض کو بدرجہ اتم نبھا رہے تھے۔ وہ نئے لکھنے والوں کے ساتھ
جھٹ دوستانہ تعلقات قائم کر لیتے تھے۔ میں اپنے تجربہ سے ان کی حوصلہ افزائی اور
انسان دوستی کا قائل ہوں ۱۹۳۸ء میں میں نے انھیں اپنا ایک افسانہ "پچھتاوا"
بھیجا۔ پہلے ان سے مطلق جان پہچان نہیں تھی۔ اور میری افسانہ نگاری کی ابتدا تھی
انھوں نے نہ صرف وہ افسانہ "زمانہ" میں شائع کیا بلکہ فوراً ہی ایک خط لکھ کر کامیاب
افسانہ لکھنے پر مبارک باد پیش کی اور متواتر لکھتے رہنے کا تقاضا کیا۔ پھر جب تک نگم
زندہ رہے ان سے خط و کتابت رہی۔ انھوں نے نہ صرف ہمیشہ حوصلہ افزائی کی
بلکہ نیک مشورے بھی دیئے۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا جو اس لئے درج کر دیا گیا کہ پریم چند کے ساتھ ان کے
تعلقات سمجھنے میں ممد ثابت ہوگا۔ انھوں نے پریم چند کے جوہر کو پہچان لیا اور اسے
سنوارنے اور نکھارنے میں حتی الوسع ان کی مدد کی۔ بعد ازاں ان کی خط و کتابت
سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی زندگی کا ایک حصہ بن گئے تھے گو عمر میں پریم چند سے
چھوٹے تھے مگر پریم چند انھیں بڑے بھائی کی طرح مانتے تھے اور زندگی کے ہر معاملہ میں
ان سے مشورہ طلب کرتے تھے۔

پریم چند کی وفات پر منشی دیا نارائن نگم نے ایک مضمون بعنوان "پریم چند کی
باتیں" زمانہ میں تحریر کیا تھا۔ اس کا شروع کا ٹکڑا ہی ان کے باہمی تعلقات پر بخوبی

روشنی ڈالتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"میرے لئے منشی پریم چند کے متعلق کوئی مدلّل و مفصّل مضمون لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے ان کا خیال آتے ہی سالہا سال کی سینکڑوں پرانی باتیں یاد آنے لگتی ہیں اور میں ان میں گم سا ہو جاتا ہوں۔

تیس سال کے قریب میرا ان کا دوستانہ نہیں بلکہ حقیقی طور پر برادرانہ تعلّق رہا۔ ذہنی طور پر ہم دونوں ہر معاملے میں ہم خیال نہیں تو ایک دوسرے کے بڑے ہمدرد ضرور تھے۔ اور وہ اکثر اصولی و ضروری باتوں میں میری رائے کو بڑی وقعت دیتے تھے۔

عجیب بات ہے کہ گو وہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے۔ لیکن شروع سے آخر تک وہ مجھے بڑے بھائی کی طرح سمجھتے رہے۔ جن دنوں ہر وقت کی بے تکلفی اور ہنسی۔ دل لگی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ میری باتوں کی بڑی قدر کرتے تھے اور میرا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ میرے عزیز ان کے عزیز اور میرے احباب ان کے احباب ہو گئے، مجھے بھی ان کے کسی معاملے میں دخل دینے میں کبھی پس و پیش نہیں ہوا۔ بہت سے امور میں تو جو میری رائے ہوتی اس پر وہ کاربند ہوتے تھے۔"

پریم چند جب ۱۹۰۵ء میں کانپور آئے تو عرصہ تک منشی دیا نارائن نگم کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہے اور پھر قریب ہی دوسرا مکان کرایہ پر لے لیا۔ اور ۱۹۰۹ء تک وہاں رہائش پذیر رہے اس کے بعد ان کا تبادلہ ہمیرپور میں ہو گیا اور وہ کانپور سے چلے گئے۔ لیکن یہ تین سال کا مختصر زمانہ بہت ہی رنگا رنگی کا زمانہ تھا۔ "زمانہ" کے دفتر میں خوب ادبی محفلیں ہوتی تھیں، خوب تنقیحیں نکالی جاتی

تھیں۔ اس کا ذکر منشی دیا نارائن نگم نے اپنے مضمون میں یوں کیا ہے
"کئی سال تک ایک ساتھ رہنے کا اتفاق رہا اور یہ میری زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ پریم چند کو نوبت رائے نظرؔ اور درگا سہائے سرورؔ اور کئی احباب و اعزا شام کے وقت دو تین گھنٹے کے لئے یک جا ہو جاتے اور زندگی کا کوئی مرحلہ اور دین و دنیا کا کوئی مسئلہ ان بے تکلف کے غور و فکر سے محفوظ نہ رہتا۔ واقعات عالم پر بحثیں ہوتیں۔ ہر معاملہ پر ردّ و کد ہوتی۔ ہر مسئلہ کی چھان بین کی جاتی۔ ایک دوسرے کی نکتہ چینی ہوتی خوب مذاق ہوتا۔ قہقہے پر قہقہے اڑتے۔"

پریم چند بہت ہی خوش خلق اور منسار واقع ہوئے تھے۔ سب دوست ان کی شرافت اور بذلہ سنجی کے قائل تھے۔ باتیں کرنے اور دوستوں کا جی بہلانے کا انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ منشی پیارے لال شاکر میرٹھی کو بھی ان دنوں کانپور آنے اور پریم چند کی دوستی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ پریم چند سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

"منشی پریم چند سے میری پہلی ملاقات کانپور ریلوے اسٹیشن پر جون ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھی۔ میں بنوں (صوبہ سرحد) سے منشی دیانارائن نگم کا طلبیدہ کانپور آرہا تھا۔ اور وہ میرے استقبال کو اسٹیشن پر آئے تھے۔ میں سامان اتروانے کی غرض سے بریک کی طرف چل دیا۔ اور میری بیوی بچے ایک طرف پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر میرا انتظار کرنے لگے۔ منشی صاحب ادھر اُدھر نظر مارتے ہوئے وہیں آنکلے اور میری بیوی سے بچوں کے باپ کا نام دریافت کیا جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ میرے ہی بچے ہیں تو بڑے تپاک سے ملے اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی

تھوڑی دیر کے بعد میں آیا تو میری بیوی نے اُن کا تعارف کرایا کہ آپ منشی نواب رائے ہیں کچھ دیر تو پلیٹ فارم پر ہی باتیں ہوتی رہیں۔ بعد ازاں باہر نکل کر گاڑی پر سوار ہوئے۔ اسٹیشن سے نیا چوک کافی دور ہے۔ لیکن پریم چند کی وجہ سے دوری مطلق محسوس نہ ہوئی۔ وہ راستہ بھر بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ گویا پرانے ملنے والے ہیں "

شاکر صاحب آگے لکھتے ہیں :-

"کانپور میں کم و بیش ڈیڑھ سال تک میرا اُن کا ساتھ رہا۔ قریب قریب ہر روز ملاقات ہوتی رہی، اور اپنے دکھ درد کی بات ایک دوسرے سے کہتے تھے۔ ان کی طبیعت میں حد درجہ انکسار اور استغنا تھا۔ اگرچہ خود بھی خوش حال نہ تھے، مگر دوسروں کی تکلیف کا اس قدر احساس تھا کہ فوراً مدد کو تیار ہو جاتے تھے تصنع سے ان کو نفرت تھی اور صاف دلی و صاف گوئی شیوہ۔ حد درجہ بزلہ سنج اور ظریف الطبع تھے، ہمیشہ قہقہہ مار کر ہنستے تھے اور اس زور سے ہنستے تھے کہ دیکھنے والے کو بھی ہنسی آجاتی تھی "

ان کے انکسار، سادگی، ملنساری میں آگے چل کر بھی کوئی فرق نہیں آیا سنہ ۱۹۳۱ء میں جب وہ لکھنؤ میں مادھوری کے ایڈیٹر تھے۔ ہندی کے افسانہ نگار جینیندر کمار جین ان سے وہاں ملنے گئے۔ گاڑی صبح صبح جاتی تھی پریم چند قیصر باغ میں ایک مکان کی اوپری منزل میں رہتے تھے جینیندر نے مکان کے نیچے سے آواز دی۔ فوراً جواب ملا اور دھوتی کرتے میں ملبوس بکھرے بالوں والا ایک پتلا دُبلا آدمی نیچے آیا اور انھیں اوپر لوا لے گیا اور انھیں ایک کمرے

میں بٹھاکر خود نہانے دھونے کا انتظام کرنے چلا گیا۔ اس بیچ میں جینیندر کمار نے پریم چند کے بڑے لڑکے شری پت رائے سے کہا :

"پریم چند جی کو بلوائیے۔ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں"

"آپ ہی تو تھے"

لڑکے نے جواب دیا، اور جینیندر کمار حیران رہ گئے۔ انھیں اپنے آپ پر وشواش نہیں آتا تھا۔

پریم چند کی رواداری، مروت اور دوستوں سے سلوک کے متعلق دیا نرائن نگم نے کافی کچھ لکھا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو :-

"دوستوں سے مسلوک ہونا چاہتے تھے اور جہاں تک ہو سکتا تھا لوگوں کی حاجت روائی کرتے تھے۔ مگر اس میں کبھی کبھی تکلیف ہو جاتی تھی جیسا کہ معمولی ذرائع رکھنے والے ہر دوست نواز اور ہمدرد انسان شخص کو بارہا تجربہ ہوا ہوگا۔ انھیں بھی خلاف توقع نقصان پیش آجاتے تھے، اور وہ بہ تقاضائے بشریت کبھی کبھی دل میں پچھتانے لگتے تھے اور خود ہی نکتہ چینی کرنے لگتے تھے چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"ایسے موقع بھی آئے ہیں جب دوستوں کی خاطر اپنے اوپر انتہائی جبر کرنے پڑے ہیں۔ لیکن میں نے اپنی اصلی حالت کو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور انھیں یہ بھرم رہا کہ میں کوئی متمول آدمی ہوں۔ فضول خرچی سے مجھے آشنائی نہیں، لیکن تمول کا اظہار مجھے پنپنے نہیں دیتا"

دراصل یہ تمول کا اظہار نہ تھا بلکہ انسانی غیرت اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی

کا تقاضا تھا کہ کوئی خاص سرمایہ نہ رکھنے کے باوجود اور اپنی آئندہ ضرورتوں کو
نظر انداز کر کے بھی وہ ضرورت مند دوست آشناؤں کی کاربراری کو تیار
ہو جاتے تھے ۔"

بیسیوں دفعہ ایسا ہوا ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی ضروری چیز خرید لائے
مگر کسی عزیز نے اُسے پسند کیا اور وہ دم بخود ہو گئے ۔ لوگوں نے انھیں دھوکا
بھی دیا ۔ خود غرض احباب سے بھی اُنھیں سابقہ پڑا مگر وہ سب کو ہنسی
خوشی نباہتے رہے .... جب پریم چند کانپور میں اسکول ماسٹر
تھے اور قلیل تنخواہ پاتے تھے ۔ وہ اپنے لئے ایک نیا کوٹ سلوا لائے اور ایک
نیا جوتا بھی خرید لائے ۔ مگر دونوں چیزیں ان کے ایک نادار عزیز جو ان دنوں
ان کے ساتھ رہتے تھے ، بے پوچھے استعمال کرنے لگے ۔ پریم چند نے
اس کا کوئی خیال نہ کیا ۔ اور خوشی خاطر سے اپنا پُرانا کوٹ اور پُرانا جوتا
پہنتے رہے ۔"[۲]

شورانی دیوی نے بھی اپنی کتاب " پریم چند گھر میں " ایسے متعدد
واقعات بیان کئے ہیں جس سے اُن کی انسان دوستی اور دوسروں سے
(ان بہنوں کے الفاظ) ان کا ہمدردی اور (بیوہار) کا پتہ چلتا ہے ۔ مثلاً ایک مرتبہ شورانی دیوی نے بڑی
مشکل سے کچھ پیسے جوڑ کر کوٹ سلوانے کو دیئے ، لیکن وہ روپے پریس کے
مزدوروں میں بانٹ آئے اور ان کے لئے کوٹ سلوانے کا انتظام از سر نو
کرنا پڑا ۔[۲]

جو اچھا انسان نہیں ہے وہ اچھا ادیب بھی نہیں ہو سکتا پریم چند کے اِس

حسن سلوک سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے بڑے انسان تھے اور یہی اُن کے بڑے ادیب بننے کی دلیل ہے اور ادب میں ان کی عظمت کو سمجھنے کے لئے زندگی کے اس پہلو کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

کانپور میں اُنھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ پڑھنے کا شوق انھیں پہلے ہی تھا یہاں اس شوق کو اور آگے بڑھانے اور اپنے خیالات کو سانچے میں ڈھالنے کا موقع ملا، اور ان کا مطالعہ ہمہ گیر ہوتا گیا۔ اور شاکر صاحب میرٹھی لکھتے ہیں :-

"منشی پریم چند کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر ایک آدھ کتاب اُن کی نظر سے نہ گذری ہو۔ اس کے ساتھ ہی حافظہ بلا کا تھا۔ قصے کہانی کی کتابیں پڑھنا اور انھیں یاد رکھنا تو کوئی قابلِ تعریف بات نہیں لیکن منشی پریم چند علمی و سیاسی کتب و رسائل کے اہم مطالب اس طرح دہرا دیا کرتے گویا پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ سیاسی معاملات میں ان کا دماغ خوب کام کرتا تھا۔ رسالہ زمانہ میں اہم سیاسی واقعات و حالات پر ایک ماہانہ تبصرہ "رفتارِ زمانہ" کے نام سے شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ تبصرہ زمانہ کی خصوصیات میں تھا اور لوگ توجہ و شوق سے اس کو پڑھتے تھے۔ ۱۹۰۷ء کے بعض تبصروں کا بڑا جزو منشی پریم چند ہی لکھتے تھے۔ انھوں نے بعض کتابوں پر تنقیدیں بھی لکھیں، اور وہ تنقیدیں زمانہ کی بہترین تنقیدوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔"

سید علی جواد زیدی لکھتے ہیں :-

"کانپور میں پریم چند کو خدا داد صلاحیتوں کے استعمال کے کافی مواقع حاصل ہوئے "آزاد" اور "زمانہ" کے صفحات ہمیشہ اُن کے لئے کھلے رہے اور اسی مشق نے انھیں ادارت کے تمام مبادیات اور اصولوں سے واقف کر دیا۔"

"آزاد" منشی دیا نرائن نگم کا ہفتہ وار اخبار تھا جو "زمانہ" ہی کے دفتر سے نکلتا تھا۔ پریم چند ان دنوں "نواب رائے" کے نام سے لکھتے تھے۔ مضمون نویسی کا انھیں زیادہ شوق نہیں تھا۔ لیکن منشی دیا نرائن نگم کی صحبت اور حسن سلوک انھیں زیادہ لکھنے کی طرف مائل کرتا رہا۔ جب منشی دیا نرائن نگم سے ان کے اتنے گہرے تعلقات ہو گئے تھے تو یہ دونوں پرچے بھی ایک طرح ان کے اپنے ہی تھے۔ اس لئے ان کے لئے لکھنا ضروری تھا۔ پریم چند سے اپنے تعلقات کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے منشی دیا نرائن نگم لکھتے ہیں:

.... دوسرے سال کے بعد آپ کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں ہو گیا .... اس طرح بے ضابطہ حیثیت سے آپ کو "زمانہ" کی اسسٹنٹ ایڈیٹری کی پوزیشن حاصل ہو گئی۔"

اس بے ضابطہ اسسٹنٹ ایڈیٹری نے پریم چند کو بہت کچھ سکھا دیا یہاں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ آج ان کے ادب کا حصہ بے شک نہ ہو لیکن یہ ان کی شخصیت کا اہم حصہ تھا۔ انھوں نے یہاں جو محنت کی اس سے اُن کی سیاسی اور سماجی واقفیت بڑھی۔ شعور میں پختگی اور وسعت پیدا ہوئی اور انھوں نے بہت بڑی بات کو اختصار سے کہنا سیکھا۔ یہ ایک ادیب کی زندگی میں بہت بڑی بات ہے۔ جب تک جذبات کی ادائیگی پر عبور حاصل نہ ہو، سیاسی

اور سماجی شعور پختہ نہ ہو، کوئی ادیب، ادیب کہلانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا"
پریم چند میں ہمیں جو جہاں تہاں دل کش محاورے اور فقرے
(GENERALIZATIONS) ملتے ہیں وہ اس محنت کا نتیجہ ہیں۔

عام عادات کے بارے میں منشی دیا نرائن نگم لکھتے ہیں کہ پریم چند
کھانے پینے میں پرہیز کے عادی نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ضعف معدہ کی شکایت
کا کامیابی سے مقابلہ نہ کر سکے۔ غذا کے متعلق اُن سے دیر تک کوئی پابندی
نہ ہو سکتی تھی اور اسی تحریک پر بار بار پرہیزی کر بیٹھتے تھے۔

مزاج بھی کبھی کبھی متلون ہو جاتا بعض اوقات ذرا سی بات مرضی کے
خلاف ہو جانے پر ملول خاطر ہو جاتے تھے۔ لیکن اگر دوسرے شخص نے اپنی
غلطی مان لی یا ان کے رفع ملال کی ذرا سی بھی کوشش کی تو پھر فوراً پانی ہو جاتے
تھے۔ جب انھیں یہ خیال ہوتا کہ دوسرے کو ان کی کوئی پروا نہیں تو اُن کے
دل پر ضرور ٹھیس لگتی تھی۔

" اوائل عمر کے واقعات اور تجربات کی بنا پر پریم چند نے زندگی کے
مسائل اور ضروریات کے متعلق کچھ خاص نظریے قائم کر لئے تھے ....
شروع میں اُن کے اصول اتنے نمایاں نہ تھے لیکن عمر کے ساتھ یہ نظریے
اُن کی تحریر و تقریر اور بیوہار برتاؤ میں دخل پانے لگے "

بمبوق

زندگی کو سکھی بنانا ہی عبادت
اور نجات ہے۔ اگر تم ہنس نہیں سکتے
رو نہیں سکتے تو تم انسان نہیں ہو۔ (پریم چند)

ماں باپ نے پریم چند کا نام دھنپت رائے رکھا۔ یہ عام دستور ہے کوئی خاص بات نہیں۔ سبھی لوگ اپنے بچے کا ایک نام رکھتے ہیں۔ لیکن جب یہ نام سب کی زبان پر چڑھ جاتا ہے تو ماں باپ اپنا پیار جتلانے کے لئے کوئی اور نام رکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ منشی عجائب لال بھی اپنے بیٹے دھنپت رائے کو پیار سے "نواب" کہا کرتے تھے۔ دھنپت رائے نے بعد ازاں اسے اپنا قلمی نام بنایا اور وہ ایک عرصے تک "نواب رائے" کے نام سے لکھتے

رہے ۔ اور بعد ازاں پریم چند بن گئے ۔ لیکن اس کے علاوہ ان کا ایک اور نام بھی تھا جو انھیں دوستوں نے دیا تھا، اور دوست جو نام دیتے ہیں وہ بہت سوچ سمجھ کر دیتے ہیں ۔ اس کی ایک داستان ہوتی ہے اور وہ نام آدمی کی پوری شخصیت کا اظہار کرتا ہے ۔

پریم چند کا یہ نام تھا "بمبوق"[1] یہ نام کیسے پڑا ؟ اس کی داستان اُن کے ہم سبق اور دوست بابو کرشن لال نے یوں بیان کی ہے :-

"......... پڑھتے لکھتے وقت اکثر اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا کرتے تھے اور تفریح کے وقت دل کھول کر تفریح کرتے ۔ آپ کی اور مرحوم بابو گرجا کشور صاحب اسسٹنٹ کمشنر آبکاری کی وجہ سے ہمارا ایک چھوٹا سا لافنگ کلب (LAUGHING CLUB) بن گیا تھا جس کا روزانہ اجلاس میرے ہی کمرے میں ہوا کرتا تھا ۔ اس میں شائد اور بھی دو ایک صاحب تھے ۔ لیکن اس وقت خیال نہیں آتا ، لیکن بہر حال ان میں سبھی ہنسنے والے تھے ۔ مگر دھنپت رائے غضب کرتے تھے ۔ جب ہنستے تو خوب ہنستے اور قہقہے پر قہقہے لگاتے چلے جاتے ۔ اسی وجہ سے ہم لوگ خاص کر یہ احقر اور گرجا کشور انھیں "بمبوق" کہا کرتے تھے ۔ اور ممکن ہے یہ لقب میرا ہی اختراع ہو ۔ اکثر اسی نام سے راقم کی اُن سے خط و کتابت بھی ہوا کرتی تھی "

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب پریم چند ٹریننگ کالج الہ آباد میں تعلیم پاتے

---

[1] بمبوق کا مطلب ہے بہت ہنسنے اور قہقہے لگانے والا

تھے منشی پیارے لال شاکر کانپوری کا واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

"تصنع سے ان کو نفرت تھی اور صاف دلی و صاف گوئی شیوہ، حد درجہ زندہ دل، بذلہ سنج اور ظریف الطبع تھے ہمیشہ قہقہہ مار کر ہنستے تھے اور اس زور سے ہنستے تھے کہ دیکھنے والے کو بھی ہنسی آجاتی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ منشی دیا نرائن نگم کے ہاں مخصوص احباب جمع تھے۔ منشی نوبت رائے نظر، منشی پریم چند اور راقم الحروف بھی موجود تھے۔ قریب ہی کسی چھت پر گراموفون میں ہربرٹ سپرڈ کا مشہور لافنگ سونگ I SAT IN A CORNER بجنے لگا، کچھ دیر تو منشی پریم چند خاموش رہے، پھر یہ کہہ کر کیجئے میں بھی اس قہقہے میں اس کا ساتھ دیتا ہوں، قہقہہ مارنے لگے۔"

یہ قہقہے کچھ بے تکلف دوستوں اور لمبا عرصہ ساتھ رہنے والوں کے لئے ہی مخصوص نہ تھے بلکہ جس آدمی کو ان سے پہلی مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوتا تھا وہ بھی ان کی رنجا رنج طبیعت سے بخوبی واقف ہو جاتا تھا۔ وہ ذرا موقع ملتے ہی آدمی کے سنسان گوشوں کو اپنے زعفرانی قہقہوں سے بھر دیتے تھے اور ملاقات کے بعد ہر شخص یوں محسوس کرتا تھا جیسے اس کی زندگی میں کسی غیر معمولی شگفتگی کا مستقل طور پر اضافہ ہو گیا ہو۔

پنڈت بنارسی داس چترویدی سابق ایڈیٹر "وشال بھارت" نے ان سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر یوں کیا ہے:۔

مجھے سب سے پہلے سنہ ۱۹۲۴ء میں پریم چند جی سے ملنے کا لکھنؤ میں اتفاق ہوا .... اس وقت وہ "رنگ بھومی" نامی ناول لکھ رہے تھے مگر

انھوں نے مجھے کافی وقت دیا۔ ہم دیر تک مختلف ادبی مسائل پر گفتگو کرتے رہے جو بات اُن کی مجھے سب سے زیادہ پسند آئی، وہ یہ تھی کہ اُن کا مزاج تکلف اور تصنع سے قطعی پاک تھا......... انھیں اپنے ملنے والوں کو تکلف برطرف کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر کی بات چیت میں ان کے ملنے والے ان کی دوستی اور رفاقت کا دم بھرنے لگتے تھے۔

اس کے بعد مجھے ۱۹۳۲ء میں ان سے بنارس میں ملنے کا اتفاق ہوا اور دو دن تک انھیں کے مکان پر قیام رہا۔ اس لطفِ صحبت کو میں تمام زندگی نہ بھول سکوں گا۔"

اور بعد ازاں اس لطفِ صحبت کو یاد کرکے لکھتے ہیں :۔"پریم چند بڑے خوش طبع، حاضر جواب اور زندہ دل تھے۔ وہ آپ کے ساتھ گھنٹوں ہنس سکتے تھے اور اپنی باتوں پر بھی ہنس پڑتے تھے .... ایک مرتبہ باتوں ہی باتوں میں دن کے دو بج گئے اور کھانا کھانے کی نوبت نہ آئی۔ یہ دیکھ کر پریم چند جی کہنے لگے کہ اتنا غنیمت ہے مسز پریم چند کے پاس گھڑی نہیں، نہیں تو اس تاخیر کے لئے جھاڑ بتائیں۔"

مرزا محمد عسکری لکھنوی نے جو بعد میں نول کشور پریس میں ان کے رفیق کار رہے پریم چند سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ اس طرح کیا ہے :۔

"منشی پریم چند سے مجھ سے پہلی مرتبہ مولانا ظفر الملک ایڈیٹر "المناظر" کی ہمراہی میں ملاقات ہوئی۔ منشی صاحب کو دیکھ کر میرے اوپر ایک خاص اثر پڑا۔ میانہ قد، چھریرا بدن، کتابی چہرہ، ناک نقشہ نہایت درست

آنکھیں بڑی اور نمایاں ، سفید صافہ باندھے ہوئے جو اُن پر بہت زیب دیتا تھا،
یہ صافہ میں نے اکثر اُن کو باندھے دیکھا ہے۔ مجھ پر منشی صاحب کی ذہانت اور قابلیت
کا ایک نظر بڑا اثر ہوا ۔ ہر چند کہ انھوں نے گفتگو میں کم حصہ لیا۔ مگر ہنسی اور مذاق
کی باتوں میں ہمارے ساتھ شامل رہے اور اگر سچ پوچھا جائے تو ہم دونوں سے
زیادہ ہنسے۔ منشی صاحب کی یہ خصوصیت تھی (جو اُن کی زندہ دلی اور نیک دلی
کی خاص علامت تھی) کہ اکثر ہنستے تھے اور زور سے قہقہے کے ساتھ ہنستے تھے"
اور بعد میں جب اکٹھے کام کرنے کا موقع ملا " میں نے ان کو دو تین برس کے
دوران میں ہمیشہ شگفتہ اور ہنس مکھ پایا۔ کبھی غصہ اُن کے چہرے پر نہ دیکھا
کبھی کبھی میں اُن سے مذاقاً کہتا تھا کہ کیوں صاحب کیا آپ کو غصہ کبھی نہیں آتا۔
کیا آپ کبھی گھر میں بھی غصہ نہیں کرتے ۔ اس پر وہ ہنس دیتے تھے "۔

ان کے ایک دوسرے رفیق کار مرزا فدا علی خنجر لکھنوی نے لکھا ہے:
"منشی صاحب بے حد خلیق، ہنس مکھ اور منکسر آدمی تھے ۔ میں نے انھیں ہمیشہ
مسکراتے ہوئے پایا ۔ چونکہ پبلشنگ ڈیپارٹمنٹ میں میرا قیام ۱۹۲۶ء تک رہا
اس لئے وقتاً فوقتاً منشی صاحب سے نیاز حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوتا رہا
جب انھیں کوئی کام نہ رہتا تو پبلشنگ ڈیپارٹمنٹ میں چلے آتے اور اپنی گل فشانیوں
سے ہمارے دماغ کو تازہ کر دیتے ۔ قلم کی طرح اُن کی زبان میں بھی زور تھا گفتگو
بہت سلیس اور دلچسپ ہوتی کہ اس کے سننے کا دل سے اشتیاق رہتا "۔

یہ تو ہم عمر اور ادیب دوستوں کی بات تھی ۔ لیکن وہ بچوں اور لڑکوں سے
بھی اسی خندہ پیشانی سے پیش آتے اور کلاس پڑھاتے وقت بھی اسی بے تکلفی

اور بے باکی سے ہنستے تھے۔ جب وہ گورکھپور میں ماسٹر تھے اس وقت کے ان کے ایک شاگرد منشی منظورالحق حکیم لکھتے ہیں:۔

"کلاس میں ان کے آتے ہی ایسی زندہ دلی پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر ایک ان کی طرف مخاطب ہو جاتا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ جو سبق پڑھانا ہے وہی پڑھایا جائے بلکہ جس موضوع کی طرف ان کا رجحان یا لڑکوں کا تقاضا ہوا بیان فرمانے لگے اگر کلاس میں پڑھاتے وقت کوئی ہنسی کی بات آگئی تو بے اختیار ہنسنے لگتے۔ کسی کا خوف و ہراس نہیں تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ انسپکٹر صاحب معائنے کے لئے آئے۔ بابو بچن لال صاحب ہیڈ ماسٹر مرحوم جو بہت سیدھے آدمی تھے کچھ پریشان سے تھے۔ تمام لڑکے بھی اپنی اپنی ڈریس سے آراستہ تھے۔ مگر ہمارے استاد صاحب کا وہی عالم تھا جو پہلے لکھ چکا ہوں۔ ننگے سر بال پریشان، کوٹ کا کالر کھلا ہوا، انسپکٹر صاحب کلاس میں آئے مگر ان کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔"

یہ قہقہے ان کی شخصیت کا مظہر تھے۔ پھول کی طرح ایک فطری مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی تھی جو کبھی جدا نہیں ہوئی تھی۔ زندگی میں اتنی مصیبتیں اور مشکلیں برداشت کرنے کے بعد بھی اگر وہ ہنس سکتے تھے، قہقہے بلند کر سکتے تھے تو صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے زندگی کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا ان کے نزدیک جینے کا حاصل رونا نہیں ہنسنا تھا۔ اس لئے وہ مصیبتوں کے باوجود خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنساتے تھے۔

ہمیں ان کے بہترین کردار بھی اسی اصول پر کاربند نظر آتے ہیں "میدان عمل"

کی اُمنی پر کیا کیا مصیبتیں نہیں پڑیں، گوروں نے اس کی عصمت دری کی، مقدمہ چلا، گھر بار چھوٹا۔ خاوند اور بچے سے الگ ہوئی، پھر بھی وہ ہنستی ہے مسکراتی ہے اور ناول کے ہیرو امرکانت سے کہتی ہے "لالہ تم مجھے رونا سکھانا چاہتے ہو لیکن میں تمھیں ناچنا سکھاؤں گی۔"

اس ناول میں امر اپنے باپ سے کہتا ہے "دادا آپ کے گھر میں میری اتنی عمر برباد ہوگئی۔ اب میں اسے اور برباد کرنا نہیں چاہتا۔ آدمی کی زندگی کا منشا محض کھانا اور مرجانا نہیں ہے۔ نہ دولت کمانا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ میری حالت اب ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے۔ میں اب ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہا ہوں، جہاں مزدوری شرم کی چیز نہیں۔ جہاں عورت اپنے شوہر کو پستی اور زوال کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ اس کی زندگی کو مسرت سے معمور کرتی ہے۔ میں رسوم اور خاندانی وقار کا غلام بن کر رہنا نہیں چاہتا مسرت ہی زندگی کی حقیقت ہے۔"

اس حقیقت کے احساس، نئی زندگی کے یقین اور مستقبل کے اعتماد سے یہ قہقہے پیدا ہوتے تھے۔ پریم چند حادثات سے کبھی پریشان نہیں ہوئے انھوں نے خندہ پیشانی اور زندہ دلی سے خارجی واقعات کا مقابلہ کیا اور زندگی کھلاڑی کی طرح بسر کی۔

منشی دیا نرائن نگم کو اُن کے ایک خورد سال بچے کی موت پر پریم چند نے تعزیت کا جو خط لکھا اس سے اُن کا زندگی کا سارا فلسفہ اور ان قہقہوں کی نوعیت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

"بھائی جان! تسلیم! کل صبح ایک خط لکھا۔ شام کو آپ کا کارڈ ملا۔ پڑھ کر نہایت صدمہ ہوا۔ بیماریاں اور پریشانیاں تو زندگی کا خاصہ ہیں لیکن بچے کی حسرت ناک موت ایک دل شکن حادثہ ہے، اور اسے برداشت کرنے کا اگر کوئی طریقہ ہے تو یہی کہ دنیا کو ایک تماشاگاہ یا کھیل کا میدان سمجھ لیا جائے کھیل کے میدان میں وہی شخص تعریف کا مستحق ہوتا ہے جو جیت سے پھولتا نہیں، ہارسے روتا نہیں۔ جیتے تب بھی کھیلتا ہے اور ہارے تب بھی کھیلتا ہے۔ جیت کے بعد یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہاریں نہیں۔ ہار کے بعد جیت کی آرزو ہوتی ہے ہم سب کے سب کھلاڑی ہیں مگر کھیلنا نہیں جانتے۔ ایک بازی جیتی، ایک گول جیتا۔ تو ہپ ہپ ہرّے کے نعروں سے آسمان گونج اٹھا۔ ٹوپیاں آسمان میں اچھلنے لگیں۔ بھول گئے کہ یہ جیت دائمی فتح کی گارنٹی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری بازی میں ہار ہو، علیٰ ہذا ہارے تو پست ہمتی پر کمر باندھ لی، روئے، کسی کو دھکے دئے، فاؤل کھیلا اور ایسے پست ہو گئے گویا پھر جیت کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوگی۔ ایسے اوچھے تنگ ظرف آدمی کو میدان میں کھڑے ہونے کا بھی مجاز نہیں۔ اس کے لئے گوشہ تاریک ہے اور فکرِ تنگم۔ بس یہی اس کی زندگی کی کائنات ہے۔ ہم کیوں خیال کریں کہ ہم سے زندگی نے بے وفائی کی! خدا کا شکوہ کیوں کریں! کیوں اس خیال سے ملول ہوں کہ دنیا ہماری نعمتوں سے بھری تھالی کو ہمارے سامنے سے کھینچ لیتی ہے۔ کیوں اس فکر سے متوحش ہوں کہ قزاق ہمارے اوپر چھاپہ مارنے کی تاک میں ہیں۔ زندگی کو اس نکتہ نگاہ سے دیکھنا اپنے اطمینانِ قلب سے ہاتھ دھونا ہے۔ بات دونوں طرح ایک ہی ہے

قزاق نے چھاپہ مارا تو کیا؟ ہار میں سارے گھر کی دولت کھو بیٹھے تو کیا؟ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جبر ہے اور دوسرا اختیار۔ قزاق زبردستی مال پر ہاتھ بڑھاتا ہے۔ لیکن ہار زبردستی نہیں آتی۔ کھیل میں شریک ہو کر ہم خود ہار اور جیت کو بلاتے ہیں۔ قزاق کے ہاتھوں لٹا جانا زندگی کا معمولی واقعہ نہیں حادثہ ہے لیکن کھیل میں ہارنا اور جیتنا معمولی واقعے ہیں۔ جو کھیل میں شریک ہوگا وہ بخوبی جانتا ہے کہ ہار اور جیت دونوں ہی سامنے آئیں گی۔ اس لئے اسے ہار سے مایوسی نہیں ہوتی۔ جیت سے پھولا نہیں سماتا۔ ہمارا کام تو صرف کھیلنا ہے۔ خوب دل لگا کر کھیلنا، خوب جی توڑ کر کھیلنا، اپنے کو ہار سے اس طرح بچانا گویا ہم کونین کی دولت کھو بیٹھیں گے۔ لیکن ہارنے کے بعد پٹخنی کھانے کے بعد گرد جھاڑ کر کھڑے ہو جانا چاہیئے۔ اور پھر خم ٹھونک کر حریف سے کہنا چاہیئے کہ ایک بار اور!

کھلاڑی بن کر آپ کو واقعی بڑا اطمینان ہوگا۔ میں خود نہیں کہہ سکتا کہ میں اس معیار پر پورا اُتروں گا یا نہیں۔ مگر کم سے کم اب پیچھے کسی نقصان پر اتنا رنج نہ ہوگا جتنا آج سے چند سال قبل ہو سکتا تھا۔ میں اب شاید نہ کہوں گا۔ کہ ہائے زندگی اکارت گئی، کچھ نہ کیا۔ زندگی کھیلنے کے لئے ملی تھی۔ کھیلنے میں کوتاہی نہیں کی آپ مجھ سے زیادہ کھیلے ہیں۔ ہار اور جیت دونوں دیکھی ہیں۔ آپ جیسے کھلاڑی کے لئے شکوۂ تقدیر کی ضرورت نہیں۔ کوئی گولف اور پولو کھیلتا ہے کوئی کبڈی کھیلتا ہے بات ایک ہی ہے۔ ہار اور جیت دونوں ہی میدانوں میں ہیں۔ کبڈی کھیلنے والے کو جیت کی خوشی کچھ کم نہیں ہوتی، اس ہار کا غم نہ کیجئے۔ آپ نے خود ہی نہ کیا ہوگا۔ آپ مجھ سے مشتاق ہیں۔ میں ۵ یا ۶ مئی تک کانپور آنے والا ہوں

یہاں کی کوئی چیز درکار ہو تو بے تکلف لکھئے گا۔ دیگر حالات میرے پہلے خط سے معلوم ہوئے ہوں گے۔"

کھلاڑی پن کا فلسفہ کلیتہً ٹھیک نہیں ہے تاہم اگر یہ فلسفہ پریم چند کے اعتماد کی بنیاد نہ بن جاتا تو جن مصیبتوں میں سے انھیں گذرنا پڑا تھا وہ یقیناً لاکھوں کروڑوں بے بس اور مصیبت زدہ ہم وطنوں کی طرح انفرادیت پسند بن جاتے ؛ اور خارجی واقعات کے خلاف جارحانہ جدوجہد کرنے کی بجائے اپنے اندر ہی مصائب کا حل ڈھونڈتے، سورگ نرک اور مکتی کی تمناہیں زندگی بے مصرف کھو دیتے۔ اس کے برعکس پریم چند نے سمجھ لیا تھا:-

"یہ مکتی اور بھکتی تو انتہائی خودی ہے جو ہماری انسانیت کو تباہ کئے ڈالتی ہے ...." (گئودان)

اور ایک دوسری جگہ "لوک جھونک" میں لکھتے ہیں :-

"سورگ اور نرک کے خیال میں وہ رہتے ہیں، جو کاہل ہیں، مردہ ہیں ہماری دوزخ اور بہشت سب اس زمین پر ہے۔ ہم اس دارِعمل میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

یہ فلسفہ پریم چند کے ادب کی بنیاد ہے۔ ان کے کردار باعمل انسان ہیں اگرچہ وہ نچلے چھوٹے طبقہ کے مفلس اور مصیبت زدہ انسان ہیں۔ اس لوٹ کھسوٹ اور خون چوسنے والے نظام میں ان کی معمولی معمولی تمنائیں بھی پوری نہیں ہوتیں۔ پھر بھی جینا اپنا حق سمجھتے ہیں اور ہمت سے جیے جاتے ہیں۔ چونکہ انھیں زندگی اور عمل میں اٹل وشواس ہے اس لئے نہیں ان کے ننھے

بھی کہیں بلند، کہیں خاموش سنائی دیتے ہیں، کہیں طنز اور کہیں حقارت کا اظہار کرتے ہیں، اور کہیں وہ ریاکاری اور پاکھنڈ پر حملہ کرکے بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں۔

ان کی ایک کہانی "بڑے بھائی صاحب" ہے، جس میں بڑا بھائی ہر وقت پڑھتے رہنے کے باوجود ہر سال فیل ہوتا ہے۔ لیکن چھوٹا بھائی اکثر کھیلتے رہنے کے باوجود ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہوتا ہے۔ پھر بھی بڑا بھائی چھوٹے کو اس لئے نصیحت کرتا اور اس پر رُعب گانٹھتا ہے کہ وہ بڑا بھائی ہے۔ یہ کہانی چھوٹے بھائی کی زبانی بیان کی گئی ہے اور شروع یوں ہوتی ہے:-

"میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے۔ لیکن صرف تین درجے آگے۔ انھوں نے بھی اسی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا جب میں نے شروع کیا، لیکن تعلیم جیسے اہم معاملے میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے اس عمارت کی بنیاد خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے۔ ایک سال کا کام دو سال میں کرتے تھے تاکہ عمارت پختہ ہو جائے۔"

ساری کہانی پڑھ جانے کا شوق دل میں چٹکیاں لینے لگتا ہے۔ کہانی مایۂ تفریح میں ایک مہاشے کا سراپا بیان کرتے ہیں:-

"مہاشے چکر دھر سر گھٹاتے تھے۔ مگر لمبی چوٹی رکھ چھوڑی تھی جو چٹیل میدان کے کسی جھنکاڑ درخت کی طرح نمایاں تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ چوٹی کے راستے جسم کی غیر ضروری اور مضر حرارت خارج ہوتی رہتی ہے، اور مقناطیسی اثر جسم کے اندر نفوذ کرتے ہیں۔"

مہاشہ اس شخص کو کہتے ہیں جو خارجی دنیا سے ناتہ توڑ کر داخلیت پسند

ہو جائے۔ زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں کو سمجھنے اور اس کے ساتھ چلنے سے انکار کردے
پھر ایسے لوگ جاہلِ مطلق اور کم ظرف ہوتے ہوئے بھی بڑے فلاسفر اور دھرماتما ہونے
کی ڈینگ مارتے ہیں۔ پریم چند ایسے لوگوں کی جیسا کہ اس کہانی کے نام "تازیہ تفریح"
سے ظاہر ہے خوب خبر لیتے تھے انھیں جھوٹے تقدس اور دقیانوسی پن سے چلم
چڑھ تھی۔ وہ اس پر چوٹ کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ اپنی "معصوم بچہ" کہانی
میں انھوں نے ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جو بالکل ان پڑھ ہے اور دوسروں
کا کھانا بنا کر گذر بسر کرتا ہے۔ لیکن اسے اپنے برہمن ہونے پر فخر ہے اس کی بابت
لکھتے ہیں :۔

"وہ برہمن ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا اس کی تعظیم کرے اور خدمت کرے
اور کیوں نہ چاہے؟ جب اجداد کی پیدا کی ہوئی ملکیتوں پر آج بھی لوگ قابض
ہیں اور اس شان سے قابض ہیں گویا انھوں نے خود پیدا کی ہوں تو وہ کیوں
اس تقدس اور امتیاز کو ترک کر دے جو اس کے بزرگوں نے پیدا کیا تھا یہی اس کا
ترکہ ہے"

اس کہانی کے کردار گنگو کا یہ جھوٹا افتخار پھر بھی قابلِ عفو ہے، کیوں کہ
وہ ان پڑھ اور جاہل ہوتے ہوئے شریف اور بھلا مانس ہے اور محنت
مزدوری کرکے روزی کماتا ہے۔ لیکن ایسے برہمنوں کی ایک بڑی فوج ہے
جنھوں نے اس آبائی تقدس اور امتیاز کو دوکان داری بنا رکھا ہے اور جن کی
دوکان پر پاکھنڈ اور ریاکاری، کمینگی اور کم ظرفی کی جنس کے سوا کچھ بھی نہیں
بنارس ہندو دھرم کی اس نحوست کا مرکز ہے۔ پریم چند کے ہاں موٹے رام شاستری

اس ساری نحوست اور کم ظرفی کا مجسمہ ہے جسے انھوں نے ساری زندگی خوب رگیدا ہے "دعوت" کہانی کا لطف اور مزاح کون بھول سکتا ہے جس میں اس پیٹو اور ڈکار و برہمن کی ہوس اور کمینگی پر پھبتیاں کسی گئی ہیں "ستیہ گرہ" میں بھی اسی حریص اور پیٹو برہمن موٹے رام کو حکام نے کرایے پر لیا ہے۔ اور یہاں بھی وہی ظرافت اور مزاح ہے۔

"پریم آشرم" (گوشۂ عافیت) میں ایک مذہبی جلسہ کا ذکر کرتے ہوئے دھرم اور تہذیب کے ٹھیکے داروں کا تلک دھاری پنڈتوں اور سنیاسیوں کا اصلی روپ پیش کیا ہے۔ ان لوگوں کی رجعت پسندی کا خوب تمسخر اڑایا ہے، لکھتے ہیں :۔

"ایک سنیاسی صاحب نے فوراً اپنا لیکچر شروع کر دیا یہ حضرت ویدانت کے ماہر اور جوگ کے کامل تھے۔ سنسکرت کے عالم تھے۔ وہ ہمیشہ سنسکرت ہی بولتے تھے اُن کی نسبت مشہور تھا کہ سنسکرت ہی ان کی مادری زبان ہے، ان کی تقریر کو لوگ اس شوق سے سنتے تھے جیسے چنڈول کا گانا سنتے ہیں کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ مگر اُن کی قابلیت اور روانیٔ بیان کا رعب لوں پر چھا جاتا تھا"

"بازارِ حسن" میں سمن بائی نے جب اپنے پیشے کو ترک کرنے کی ٹھان لی تو وٹھل داس سے کہا کہ میں ذرا چلتے چلاتے اپنے عاشقوں کی مزاج پرسی تو کر لوں۔

اب سہانے رسیا میاں ابوالوفا اور بھنسا قد لالہ چمن لال اور بگلا بھگت

پنڈت دینا ناتھ ایک ایک کرکے آتے ہیں، اور وہاں ان کی جوگت بنتی ہے، وہ ناول میں ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔

قہقہے نشتر ہیں جو سماج کی رگوں سے گندا مواد نکالنے کے لئے فصد لگانے کا کام دیتے ہیں۔ یہ قہقہے کہیں بھی بے مصرف نہیں ہیں۔ جوں جوں پریم چند کا شعور اور فن پختہ ہوتا گیا یہ نشتر زیادہ تیز اور زیادہ کارگر ہونے گئے۔ اُن کے استعمال کا ڈھنگ بھی بدل گیا۔

انھوں نے مذہبی، سماجی، اخلاقی اور سیاسی ہر موضوع اور ہر پہلو پر لکھا ہے لیکن وہ کہیں بھی زاہد خشک نہیں بنے۔ موضوع جتنا دقیق اور پیچیدہ ہوتا ہے طرز تحریر اتنا ہی شگفتہ ہو جاتا ہے۔ آدمی یہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتا کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اُس پر ہنسے یا روئے۔ بڑی دیر تک گومگو کی کیفیت طاری رہتی ہے اور جتنا آدمی سوچتا ہے اتنا ہی اثر زیادہ ہوتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ بہت بڑی بات نہایت مختصر الفاظ میں کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً یہ بہت بڑی بات تھی کہ گاندھی نے چورا چوری کے واقعہ کی آڑ لے کر عدم تعاون کی تحریک کو یکا یک بند کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتنا بڑا قومی اتحاد ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اور آزادی کی جدوجہد نے شدھی اور تبلیغ کا روپ دھارن کر لیا ممکن نہیں کہ یہ حالت دیکھ کر پریم چند کا حساس دل آنسو نہ رو دے۔ لیکن ان کا رونے کا ڈھنگ مختلف تھا۔ "بڑے بابو" کہانی پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس طرح اپنے درد کو ظرافت میں سمو دیا ہے۔ در اصل یہ ان کا اپنا

درد نہیں۔ مظلوم اور فریب خوردہ انسانیت کا درد ہے۔

چھ سو صفحات کا ناول "گئو دان" کیا ہے۔ اسی انسانیت کے درد کی تصویر ہے۔ گاندھی کا نمک ستیاگرہ جس کی پریم چند نے شدومد سے تائید کی تھی۔ گاندھی اروِن پیکٹ میں ختم ہوگیا۔ گاندھی اچھوت اودھار میں جٹ گئے اور کسان بے چارے کو جو اس تحریک کی جان تھا بے بس چھوڑ دیا گیا۔ اب اس کا دکھڑا کون روئے؟ پریم چند، لیکن پریم چند کا شعار رونا نہیں تھا۔ رونا بے عملی کی دلیل ہے، اور ان کے کردار ہوری، گوبر، دھنیا اور جھنیا بھی روتے نہیں، مصیبتوں کے باوجود ہنستے ہیں۔ زندگی کی جدوجہد جاری رکھتے ہیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے افعال کے ذریعے ان جانے ہی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

جدوجہد ان کرداروں کی زندگی کا جزو ہے۔ اسی طرح قہقہے بھی ان کی زندگی کا جزو بن کر سامنے آتے ہیں مثلاً جھنیا گوبر کو اپنی زندگی کے واقعات سنا رہی ہے کہ وہ دودھ لے کر جاتی تھی تو لوگ کس طرح حریص نگاہوں سے اس کی رس بھری جوانی کی طرف دیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک تلک دھاری پنڈت تو اس قدر بڑھے کہ جھنیا کو زبردستی پکڑنا چاہا، لیکن چالاک جھنیا نے دودھ کی مٹکی پنڈت کے سر پر پٹک دی۔ یہاں پریم چند لکھتے ہیں

"گوبر قہقہہ لگا کر بولا " بہت اچھا کیا تم نے، دودھ سے نہا گیا ہوگا۔ تلک چھاپا بھی دھل گیا ہوگا۔ مونچھیں بھی کیوں نہ اکھاڑ لیں"

قہقہے تحریک کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ پڑھنے والے کے دل میں تحریک

پیدا ہوتی ہے کہ سماج کے رنگے سیاروں کی سچ مچ مونچھیں اکھاڑ لی جائیں۔

اس ناول کا ایک اور واقعہ۔ جب مس پالتی جیتے ہوئے پارسا ادنکار داس کو شراب پینے کی ترغیب دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو رائے صاحب کی محفل میں جان سی پڑ جاتی ہے۔

" ہال میں ایسا شور مچا کہ کچھ نہ پوچھو جیسے پٹاری میں سے بلند قہقہے نکل پڑے ہوں۔ واہ دیوی جی کیا کہنا۔ کمال مس مالتی کمال ہے۔ توڑ دیا نمک کا قانون، توڑ دیا دھرم کا قلعہ، توڑ دیا پارسائی کا گڑھ!"

اب ایڈیٹر اونکار داس کھسیانے ہو کر دلیل بازی کرنے لگے تو جیت بڑی: "قانون بھی تو بندھن ہے اسے کیوں نہیں توڑتے؟ بس یہی بندھن توڑو جو اپنی ہوس رانیوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہوں۔ اس کو سانپ بنا کر پٹیو اور تیس مار خاں بنو۔"

پریم چند کی محفلوں میں۔ بڑھے، ان پڑھے، بڑے، چھوٹے مرد اور عورتیں سب ہنستے ہیں، جو ہنس نہیں سکتے اُن سے پریم چند کو کوئی ہمدردی نہیں۔ اب ذرا خالصتاً عورتوں کی محفل دیکھئے "قربت" کہانی کی جگنو بائی پوری شیطان کی خالہ ہے۔ دوسروں کے چھوٹے چھوٹے نقائص اور برائیاں جمع کرنا اور انھیں اِدھر اُدھر پھیلانا اس کا کام ہے جس کی وجہ سے آشرم کی چھوٹی بڑی اُستانیاں سبھی اس سے ڈرتی ہیں لیکن نئی ہیڈ مسٹرس مس خورشید نے اس کی ساری شیخی کرکری کر دی۔ اسے بنانے کے لئے ولیم کنگ سے معاشقہ کا ڈرامہ کھیلا۔ اب جگنو کو یہ بات کہاں

پہنچی، رات بھر بڑی مشکل سے کاٹی صبح ہوتے ہی سارے آشرم میں یہ خبر
پھیلادی اور مس خورشید کے خلاف طومار باندھا۔ لیکن جب آخر میں معلوم
ہوا کہ رات کو مس خورشید کے پاس شراب کے نشے میں دھت جو نیم کنگ آیا
تھا اور جس سے ڈر کر جگنو بائی بھیگی بلی کی طرح دبک گئی تھی۔ وہ دراصل آشرم کی
ڈاکٹر لیلاوتی ہیں، اور مس خورشید اور لیلاوتی نے صرف جگنو کو بنانے اور
ذلیل کرنے کے لئے یہ کھیل کھیلا ہے تو..........

"........ چاروں طرف قہقہے بلند ہوئے۔ کوئی تالیاں بجاتی
تھی کوئی ڈاکٹر لیلاوتی کی گردن میں لپٹی جاتی تھی۔ کوئی مس خورشید کی پیٹھ
پر تھپکیاں دیتی تھی۔ کئی منٹ تک ہوحق مچا رہا۔ جگنو کا منہ اس روشنی
میں بالکل ذرا سا نکل آیا۔ زبان بند ہو گئی۔ ایسا چرکا اس نے کبھی نہ کھایا
تھا۔ اتنی ذلیل کبھی نہ ہوئی تھی

....

....

اس دن سے پھر کسی نے جگنو کی صورت نہیں دیکھی۔ آشرم کی تاریخ
میں یہ معاملہ آج بھی مایۂ تفریح بنا ہوا ہے۔

۵

سوزِ وطن

وہ تلوار جو کیلے کو بھی نہیں کاٹ سکتی
دھار پر چڑھ کر لوہے کو بھی کاٹ سکتی ہے
انسانی زندگی میں دھن بڑے کام کی چیز
ہے جس میں لاگ ہے وہ بوڑھا بھی جوان ہے
جس میں لاگ نہیں، عزت نہیں، وہ
جوان بھی ہو تو مردہ ہے۔

(پریم چند)

کانپور سے پریم چند ۱۹۰۹ء میں مہوبا ضلع ہمیر پور میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے سب انسپکٹر ہو کر چلے گئے، اور مہوبا میں چھ سال تک مسلسل رہے اور یہیں انھوں نے اپنے مشہور تاریخی افسانے "آلھا"، "رانی سارندھا" اور

"وکرماوت کا تیغہ" وغیرہ لکھے۔ ان میں بندیلے راجپوتوں کی بہادری اور جواں مردی کے قصے بیان کئے گئے ہیں اور ان کا مختصر ناول "رودٹھی رانی" بھی انھی بندیلے راجپوتوں کی شجاعت سے متعلق ہے۔ ان کہانیوں کے کرداروں کے لئے آن پرمٹ جانا معمولی بات ہے ۔ لیکن راجپوتوں کی تعریف سے پریم چند کا مقصد احیا پرستی ہرگز نہیں تھی۔ ان کہانیوں کے ذریعے وہ ہندوستانی عوام کی خود داری اور علو ہمتی کو بیدار کرتے ہیں ان کی سوئی ہوئی غیرت کو جگاتے ہیں اور بے حسی کو متحرک کرتے ہیں۔

۱۹۰۵ء میں عالم گیر اقتصادی سنکٹ نمودار ہوا سرمایہ دارانہ نظام کا یہ سب سے پہلا خوفناک سنکٹ تھا۔ نوآبادیات کی تقسیم مکمل ہو چکی تھی، جرمنی وغیرہ ممالک کی نئی سرمایہ داری کو پھیلنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ سرمایہ داری کا اندرونی تضاد پوری شدت سے ابھر آیا تھا جو آگے چل کر ۱۹۱۴ء کی عالم گیر جنگ پر منتج ہوا۔

اس سنکٹ کے ساتھ ہی ۱۹۰۵ء میں عالم گیر بے کاری پھیل گئی جس کی وجہ سے ایشیائی ممالک میں مغربی سامراجیوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد منظم اور تیز ہونے لگی۔ ہندوستان میں آزادی کی اس جدوجہد نے تقسیم بنگالہ کے خلاف تحریک کا روپ دھارن کیا اور کانگریس جس کا کام اب تک ریزولیوشن پاس کرنا اور انگریزوں سے مراعات مانگنا تھا "سوراج" کی باتیں کرنے لگی، اور اس میں گرم دل کی بنیاد پڑ گئی انگریز حکمرانوں نے تعلیمی اداروں پر قبضہ کر کے ہندوستان کی تاریخ کو بالکل مسخ

کر دیا تھا، وہ نوخیز دماغوں میں پست ہمتی کا یہ جذبہ بھر دینا چاہتے تھے کہ ہندوستانی قوم ہمیشہ سے بچھڑی ہوئی ہے اور وہ صرف محکوم رہنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اس غلط فلسفہ کا تدارک کرنے کے لئے رانا ڈے، تلک اور لاجپت رائے وغیرہ کانگریسی لیڈروں اور دانشوروں نے تاریخ کو از سر نو لکھا کیونکہ تاریخ وہ اسلحہ خانہ ہے جہاں سے محکوم قوموں کو اپنے غیر ملکی حاکموں کے خلاف لڑنے کے لئے عمل کی تحریک ملتی ہے۔ پریم چند بھی شاید اسی لئے تاریخی کہانیاں لکھنے کی طرف مائل ہوئے تھے۔ لیکن اُن کے ذہن کی ساخت کانگریسی لیڈروں سے مختلف تھی۔ وہ عوام میں سے پیدا ہوئے تھے اور عوام کے لئے تحریک کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ اس لئے تاریخ کے متعلق ان کا نظریہ لیڈروں سے بہت حد تک مختلف ہے۔ اور انھوں نے اپنی تاریخی کہانیوں میں عوام کو مخاطب کیا ہے۔

اگر کوئی ادیب اپنے وقت سے آگے نہ جا سکے تو کم از کم وقت کا ساتھ دینا تو اس کا فرض ہوتا ہے چنانچہ پریم چند نے اپنی اس دور کی کہانیوں میں حب الوطنی کے جذبے کو ابھارا ہے۔ "دنیا کا سب سے انمول رتن" میں جسے وہ اپنی پہلی کہانی کہتے ہیں، اور جو ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ خون کے اس قطرے کو انمول رتن کہا ہے جو وطن کی محبت میں بہایا جاتا ہے۔ ان کے ناول جلوہ ایثار کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک ماں دیوی کی لگاتار پوجا کرتی ہے۔ جب دیوی خوش ہو جاتی ہے تو ماں بردان مانگتی ہے کہ مجھے ایسا بیٹا دے۔ دیوی نے پوچھا جو بہت دھنوان ہو، بلوان ہو یا دنیا بھر

میں شہرت حاصل کرے۔ لیکن ماں نے کہا "نہیں مجھے ایسا بیٹا چاہیئے جو وطن کی خدمت کرے۔"

یہ ناول اُنھی دنوں لکھا گیا تھا اور ۱۲-۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا لیکن اس ناول سے پہلے ۱۹۰۹ء میں ان کی ایک کتاب "سوزِ وطن" شائع ہوئی جو اُن کی زندگی میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف ان کی اس لڑائی کا آغاز اس کتاب سے ہوا جسے وہ پھر ساری عمر زندگی سے لڑتے رہے۔ ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ اُن کا قدم ہمیشہ آگے ہی بڑھتا رہا۔ آخر یہ لڑائی ہر قسم کے سیاسی، طبقاتی اور سماجی ظلم اور رجعت پسندی کے خلاف لڑائی بن گئی، اور یہ لڑائی اُن کی ادبی تخلیقات کو جلا دیتی رہی۔

"سوزِ وطن" پریم چند کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ تھا جو پانچ کہانیوں پر مشتمل تھا۔ اس میں "دُنیا کا سب سے انمول رتن" کے علاوہ چار کہانیاں اور شامل تھیں۔ یہ مجموعہ زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا تھا اور قیمت پانچ آنے تھی۔ ان سب کہانیوں میں کسی نہ کسی ڈھنگ سے حب الوطنی کے جذبے کو ابھارا گیا تھا۔ اب انگریز حکمران یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی ادیب ہندوستانیوں میں بھی حب الوطنی کے جذبے کو بھڑکائے۔ انھوں نے نہ صرف کتاب ضبط کی بلکہ جتنی کتابیں اُن کے ہاتھ لگیں انھیں اسی وقت آگ میں جلا دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ادیب کی کتابوں کو اس کی نظروں کے سامنے یوں نذرِ آتش کیا گیا۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ اس سے اس کا حب الوطنی کا جذبہ بھی جل جائے گا۔ لیکن یہ اُن کی بھول تھی۔ اس

جبر سے یہ شعلہ اور بھی بھڑک اُٹھا۔

36 "سوزِ وطن" کی کہانیاں فن کے اعتبار سے کچھ زیادہ اچھی نہیں تھیں
فراق گورکھپوری رقمطراز ہیں کہ تیس برس ہوئے، ان کے پانچ افسانے "سوزِ وطن"
کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوئے۔ پریم چند اور اُن کے متبعین نے
اردو ہندی زبان میں افسانہ نویسی کو اس بلند مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں آج ہم
اسے دیکھتے ہیں۔ عصرِ حاضر کی بہترین تصانیف کی چمک کی روشنی اس
کتاب کی ہلکی اور دھیمی روشنی کو سایے میں ڈال دے گی۔ مگر تاریخ افسانہ نگاری
میں وہ ایک رفیع نشان ہے۔ وطن پرستی کا شریف جذبہ ان صفحات میں
سانس لے رہا ہے۔ ان کہانیوں میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں ہے،
وہ نہایت اطمینان سے لڑکے اور لڑکیوں کی درسی کتابوں میں داخل کی جا سکتی ہیں
لیکن تیس برس پہلے کی دنیا اور تھی! باخبر اور خائف عمّالِ حکومت نے مصنف
سے باز پرس کی۔ میری ان کی ملاقات کو زیادہ دن نہ گذرے تھے جب انھوں
نے اپنے بے تکلف اور صاف طرز میں مجھ سے بیان کیا کہ انسپکٹر مدارس
نے انھیں کس طرح اپنی تصنیف کی پانچ سو جلدوں میں آگ لگا دینے پر مجبور کیا۔"

پریم چند کے دل پر اس واقعہ کا گہرا اثر پڑا تھا، کوئی بھی دوست اور
رفیق ایسا نہ ہوگا جس سے انھوں نے اس واقعے کا ذکر نہ کیا ہو اور واقعہ کو
بیان کرتے وقت ان کے دل کا درد اور سوز اُبل پڑتا تھا۔ گویا ایک زخم
تھا جو ہر وقت رستا رہتا تھا اور اندمال کی صورت ڈھونڈ رہا تھا۔

منشی پیارے لال شاکر میرٹھی لکھتے ہیں:۔

۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء کا ذکر ہے۔ منشی صاحب اس زمانے میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ اور ہمیر پور میں قیام تھا کسی خاص ضرورت سے مجھے کانپور جانا پڑا اتفاق سے بازار میں منشی پریم چند سے ملاقات ہو گئی۔ ایک گھنٹے تک ساتھ رہا۔ اسی ایک گھنٹے میں دنیا بھر کی باتیں ہو گئیں۔ میں نے "سوز وطن" کے بارے میں کیفیت دریافت کی تو کہا "کیا کہوں، بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا وہ تو خیریت ہوئی کہ کتابیں دے کر پیچھا چھوٹ گیا۔ ورنہ جان پر آ بنی تھی۔ اس کے بعد "جان بچی اور لاکھوں پائے" کہہ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد فرمایا "منشی دیا نرائن نگم کے مطبع سے پہلی کتاب "سوز وطن" شائع ہوئی تھی معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی کہ کتاب پر پبلشر اور پرنٹر کا نام نہیں چھپا ظاہر ہے کہ ایسی غلطی عمداً نہیں ہوا کرتی۔ مگر سنتا کون ہے۔ جانچ پڑتال ہوئی تو اس سلسلے میں میرا نام بھی کھل گیا۔ خود ہی سوچو، کہ ایک سرکاری ملازم اور اور "سوز وطن" ایسی مسموم کتاب کا مصنف! توبہ، توبہ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کتابوں پر بلا ٹل گئی ورنہ کیا عجب تھا کہ مانڈلے کی ہوا کھانی پڑتی"۔ اتنا کہہ کر پھر ایسے زور کا قہقہہ لگایا کہ بازار والے بھی ہکّا بکّا رہ گئے"۔

شاکر صاحب فرمایے لکھتے ہیں:-

"سوز وطن" مختصر سی کتاب تھی جس میں پانچ چھ مختصر افسانے تھے اور قیمت بھی چار پانچ آنے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن یہی وہ کتاب ہے جس نے انھیں پریم چند بنا دیا۔ یہ افسانے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ ملکی و قومی جذبات کے ترجمان تھے اور عام طور پر ان کو بہت پسند

کیا گیا تھا۔ منشی صاحب کا تعلق محکمۂ تعلیم سے تھا "سوزِ وطن" پر نہ صرف اعتراض ہوا بلکہ ملازمت تک کے لالے پڑ گئے۔ خدا خدا کرکے دو بلا ٹل گئی اور اسی کی ساتھ منشی جی کی بھی کایا پلٹ ہو گئی۔

اب تک وہ "نواب رائے" کے نام سے لکھتے تھے۔ اس واقعے کے بعد انھوں نے پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ لیکن نام تبدیل کرتے ہوئے انھیں بہت قلق ہوا۔ منشی دیا نرائن نگم کو بھی "سوزِ وطن" پر پرنٹ لائن نہ چھاپنے کی بھول کرنے کی پاداش میں پچاس روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا تھا۔ چنانچہ اس معاملے سے اُن کا بھی براہِ راست تعلق تھا اور پریم چند نام انھیں نے تجویز کیا تھا، لکھتے ہیں:

پریم چند شروع میں "نواب رائے" کے نام سے لکھا کرتے تھے اور یہ نام انھیں بہت عزیز تھا، کیونکہ اُن کے والد پیار سے "نواب" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اور یہ نام ہندو مسلمان کے معاشرتی اتحاد کی یاد بھی تازہ رکھنے والا تھا۔ مگر جب سوزِ وطن کی بے ضابطہ ضبطی کے بعد اُن کے افسران نے انھیں تصنیف و تالیف کی ممانعت کر دی تو اُن کو اس نام کو خیر باد کہنا پڑا۔ ان تنگ خیال افسروں کا بس چلتا تو آج ہندوستانی ادب میں پریم چند کا وجود ہی نہ ہوتا۔ مگر دریا کا بہاؤ کس نے روکا ہے ہوا کا رُخ کون بدل سکا ہے؟ "نواب رائے" کی روح نے "پریم چند" کے قالب میں جنم لیا۔ یہ نام راقم الحروف ہی نے تجویز کیا تھا اور عرصے تک وہ اس نام سے صرف "زمانہ" ہی میں لکھتے رہے۔ یہ پابندی خود اُن کی

محبت نے اُن پر عائد کی تھی ورنہ اس کا کوئی مطالبہ یا معاہدہ نہ تھا۔"

پریم چند اس کے قائل نہ تھے کہ گورنمنٹ ہر قسم کی زیادتی کرے اور وہ اس کے ساتھ انتہائی ایمانداری برتتے رہیں۔ چنانچہ سوزِ وطن کی جس قدر کاپیاں ان کے پاس تھیں وہ انھوں نے حکام کے حوالے کر دیں۔ مگر میرے پاس جو اسٹاک باقی رہ گیا تھا اس کی کسی نے خبر نہ لی اور یہ کتابیں ضائع ہونے سے بچ گئیں اور آہستہ آہستہ فروخت ہوتی رہیں۔ پریم چند تصنیف و تالیف و مضمون نگاری کے متعلق اپنے افسروں کا حکم جائز نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کی اعلانیہ خلاف ورزی نہ کر سکنے پر بھی وہ "پریم چند" کا نام اختیار کر کے پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی سے لکھنے لگے۔ پریم چند کے نام کے متعلق یہاں پر ان کے ایک خط کا اقتباس بے جا نہ ہوگا جو انھیں دنوں انھوں نے راقم الحروف کو لکھا تھا:۔

"برادرم! ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ اب مفصل خط لکھ رہا ہوں۔ میں نے "بکرمادت کا تیغہ" ایک قصہ لکھنا شروع کیا ہے۔ بارہ تیرہ صفحے لکھے ہوئے ہیں۔ شائد پانچ چھ صفحے اور چلے۔ جلد ہی ختم کر کے بھیجوں گا۔

"پریم چند" اچھا نام ہے، مجھے بھی پسند ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سال میں "نواب رائے" کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی وہ سب اکارت ہو گئی، یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ لنڈورے رہے۔ اور شاید رہیں گے۔

یہ قصہ (بکرماوت کا تتبع) میرے خیال میں کئی مہینے سے تھا۔ میں نے اپنے خیال میں رابندر ناتھ کے طرز کی کامیابی کے ساتھ پیروی کی ہے مگر بری نقل نہیں ہے۔ پلاٹ بالکل اوریجنل ہے۔ میں نے تو کئی قلم توڑ دئے ہیں اور دس پانچ ورق بھی کالے کر ڈالے۔ معلوم نہیں آپ کو پسند آتا ہے یا نہیں۔ یہ قصہ ملا کر میرے پانچ قصوں کا مجموعہ نکالنے کا کافی مسالہ جمع ہو جائے گا .... اس مجموعے کا نام میں نے "برگ سبز" سوچا ہے۔ شاید آنجناب کو پسند آئے۔ اس لئے کہ ناموں کی پسند کے بارے میں آپ کی پسند کا قائل ہوں"۔

اس کے بعد وہ ایجوکیشنل گزٹ الہ آباد میں مضامین لکھنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں اور اسے دوسرے نام سے بھیجنا تجویز کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "میرے لئے کلکٹر کو ہر ایک مضمون دکھلانے کی ایسی پخ لگی ہے کہ ایک مضمون مہینوں میں لوٹ کر آتا ہے .... ایجوکیشنل گزٹ میں پریم چند کا نام نہیں دینا چاہتا۔ معلوم نہیں یہ حضرت ہاتھ پاؤں سنبھالنے پہ کیا لکھیں پڑھیں۔ انھیں قصہ گہ ہی رہنے دیجئے۔ بیٹھے بیٹھے پریم اور بیر رس کے قصے لکھا کریں"۔

اس سے پہلے کل پہاڑ ضلع ہمیر پور سے لکھا کہ :-

"نواب رائے تو کچھ دنوں کے لئے اس جہاں سے گئے وہ یاد دہانی ہوئی ہے کہ تم نے معاہدے میں گو اخباری مضامین نہیں لکھے مگر اس کا منشا ہر قسم کی تحریر سے تھا۔ گویا خواہ میں کسی عنوان پر لکھوں۔ خواہ وہ ہاتھی دانت

ہی پر کیوں نہ ہو۔ مجھے پہلے جناب فیض مآب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت
میں پیش کرنا ہوگا اور مجھے چھٹے چھ ماہے لکھنا نہیں۔ یہ تو میرا روز کا دھندا
ٹھہرا۔ ہر ماہ ایک مضمون صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچے تو وہ یہ سمجھیں
گے کہ میں اپنے فرائض سرکاری میں خیانت کرتا ہوں۔ اور کام سر پر تھوپا جائے
گا۔ اس لئے نواب رائے مرحوم ہوئے، اُن کے جانشین کوئی اور صاحب
ہوں گے۔"

پریم چند نے ایک مضمون میں اپنے جو مختصر حالات قلم بند کئے ہیں اس میں
"سوزِ وطن" کی ضبطی کا ذکر خاص تفصیل سے کیا ہے۔ کیونکہ کالج میں پڑھنے کا
ارمان دل میں رہ جانے کے واقعہ کی طرح اس واقعہ نے بھی ان کے دل پر
خاص اثر کیا تھا، لکھتے ہیں :۔

"اس وقت میں سررشتۂ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھا اور
ہمیر پور کے ضلع میں تعینات تھا۔ کتاب کو نکلے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک
دن رات کو میں اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا جو ایک انگریز تھے
پروانہ پہنچا کہ فوراً آ کر مجھ سے ملو۔ جاڑے کا موسم تھا، میں نے بیل گاڑی جتوائی
اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر طے کر کے دوسرے دن صاحب سے
ملا۔ اُن کے سامنے "سوزِ وطن" کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا
اس وقت میں نواب رائے کے نام سے لکھا کرتا تھا۔ مجھے اس کا کچھ کچھ پتہ مل
چکا تھا کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان
لوگوں نے مجھے کھوج نکالا، اور صاحب بہادر نے اسی کی جواب دہی کے لئے

مجھے بلایا ہے

صاحب نے مجھ سے پوچھا — "کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے ؟"

میں نے کہا "ہاں !"

صاحب نے ایک ایک کہانی کا مجھ سے مطلب پوچھا - اور آخر میں بگڑ کر بولے۔

"تمھاری کہانیوں میں سیڈیشن بھرا ہوا ہے - اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریزی عمل داری میں ہو، مغلوں کا راج ہوتا تو تمھارے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے جاتے - تمھاری کہانیاں یک طرفہ ہیں - تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے وغیرہ"

آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ میں "سوزِ وطن" کی کل کاپیاں سرکار کے حوالے کر دوں اور آئندہ صاحب سے اجازت لئے بغیر کچھ نہ لکھوں - میں سمجھا کہ جلد سستے چھوٹ گیا - کل ہزار کاپیاں چھپی تھیں - اور ابھی مشکل سے تین سو جلدیں فروخت ہو سکی تھیں - میں نے بقیہ سات سو کاپیاں منگا کر صاحب کی نذر کر دیں -

میں سمجھا بلا ٹل گئی - لیکن افسران محکمہ کی اس سے سیری نہ ہوئی، لیکن جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا - کلکٹر نے ضلع کے دوسرے افسروں سے بھی میرے بارے میں مشورہ کیا - سپرنٹنڈنٹ پولیس، دو ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس جن کا میں ماتحت تھا میری تقدیر کا فیصلہ کرنے بیٹھے - ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب نے میری کہانیوں سے ثابت کیا کہ ان میں شروع سے لے کر آخر تک باغیانہ خیالات اور انقلاب انگیز جذبات کے سوا اور کچھ نہیں، محکمہ پولیس کے خداوند نے کہا کہ ایسا خطرناک آدمی سخت سزا کا مستحق ہے - ڈپٹی انسپکٹر صاحب

کو مجھ سے بڑی محبت تھی اس ڈر سے کہ کہیں معاملہ طول نہ پکڑے۔ انھوں نے کہا کہ وہ دوستانہ طریق پر میرے سیاسی خیالات کا پتہ لگا کر کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کریں گے۔ دراصل ان کا ارادہ تھا کہ مجھے سمجھا بجھا کر رپورٹ میں لکھ دیں کہ مصنف صرف قلم کا مرد ہے۔ مگر سیاسی امور سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کمیٹی نے اس مشورہ کو پسند کیا حالانکہ پولیس کے خداوند اس وقت بھی پینترے بدلتے رہے۔"

معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن پریم چند نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ انگریز لوہا نہیں بگڑتا۔ ادب بھی آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں زبردست ہتھیار ہے، اور انھوں نے اس ہتھیار کو پہلے سے زیادہ تیز اور موثر کرکے لڑتے رہنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اب لڑائی جاری رکھنے کے لئے انھوں نے جوڑ ڈھنگ اختیار کیا۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی کہانی "رانی سارندھا" میں کیا ہے، جو انھی دنوں لکھی گئی تھی۔ لکھتے ہیں:-

"دنیا ایک عرصۂ کارزار ہے اس میدان میں اسی سپہ سالار کو فتح نصیب ہوتی ہے جس کی آنکھیں موقع شناس ہوتی ہیں۔ جو موقع دیکھ کر جتنی سرگرمی اور جوش سے آگے بڑھتا ہے اتنے ہی جوش اور سرگرمی سے خطرے کے مقام پر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ یہ مرد میدان سلطنتیں قائم کرتا اور قومیں بناتا ہے اور تاریخ اس کے نام پر عظمت کے پھول نثار کرتی ہے۔"

نیا بیاہ

میں بیاہ کو روحانی ارتقاء کا ذریعہ
سمجھتا ہوں۔ عورت، مرد کے رشتہ
کا اگر کوئی مطلب ہے تو یہی ورنہ میں
بیاہ کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔" (پریم چند)

دیہات میں اور عموماً شہروں میں بھی صغر سنی کی شادی کا رواج تھا پریم چند بھی اس رواج کا شکار رہے۔ باپ نے ان کی شادی تیرہ چودہ سال کی عمر میں کر دی تھی، جس کا انھیں سخت افسوس رہا۔ جوان بیوی دل میں طرح طرح کے ارمان لے کر آئی تھی وہ پورے نہ ہو سکے ادھر پریم چند کے اپنے ہی ارمان پورے نہ ہوئے تھے، کالج میں پڑھنے کی حسرت

دل میں رہ گئی تھی وہ بیوی کے ارمانوں کا خیال کیا رکھتے ؟ سکول ماسٹر ہوئے
تو سوتیلی ماں اور بھائیوں کا بوجھ سر پر آ پڑا - بیوی کو اس بات سے بڑی
کدھی اور وہ ہمیشہ کڑھتی رہتی تھی - وہ چاہتی تھی کہ خاوند اب کمانے لگا ہے
وہ خود مختار بنے - ہر ماہ کی تنخواہ اسے لا کر دے اور وہ اپنی مرضی سے خرچ
کرے - مگر گھر میں سوتیلی ماں کا راج رہا اور وہ اپنے آپ کو اس کی دست نگر
سمجھتی رہی - اس کا غصہ پریم چند پر اترتا تھا -

" مستعار گھڑی " کے ہیرو میں جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں - پریم چند
کی زندگی کے نقوش صاف جھلکتے ہیں - وہ سسرال جاتا ہے وہاں بیوی سے
ملاقات کا حال یوں بیان کیا گیا ہے -

" رات کو دیوی نے پوچھا - " سب روپے اڑا دئے کہ کچھ بچا بھی ہے "
میرا سارا جوشِ الفت سرد پڑ گیا - نہ خیر و عافیت ، نہ محبت کے راز و نیاز
شکوے و شکایتیں - بس ہائے روپے ہائے روپے - جی میں آئی اسی وقت اٹھ
کر چل دوں - لیکن ضبط کر لیا - بولا - میری آمدنی جو کچھ ہے - وہ تو تمھیں معلوم
ہی ہے -

میں کیا جانوں تمھاری آمدنی کیا ہے - کماتے ہوگے اپنے لئے - میرے
لئے کیا کرتے ہو - تمھیں تو بھگوان نے عورت بنایا ہوتا تو اچھا ہوتا - رات دن
کنگھی ، چوٹی کیا کرتے - تم ناحق مرد بنے - اپنے شوق سنگار سے بچتا ہی نہیں
تم دوسروں کی کیا فکر کروگے ؟ میں نے جھنجھلا کر کہا ——— کیا تمھاری یہی
مرضی ہے کہ اسی وقت چلا جاؤں -

دیوی جی نے تیوریاں چڑھا کر کہا چلے کیوں نہیں جاتے ہو تو تمھیں بلانے
نہ گئی تھی، یا میرے لئے کوئی روکڑ لائے ہو۔
میں نے ملامت آمیز انداز سے کہا۔ تمھاری نگاہ میں محبت کی کوئی قدر
نہیں ہے جو کچھ ہے وہ روکڑ ہی ہے۔
دیوی جی نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ محبت اپنے آپ سے
کرتے ہوگے۔ مجھ سے تو نہیں کرتے۔
تمھیں پہلے تو یہ شکایت نہ تھی۔
اس سے تمھیں یہ تو سمجھ ہی لینا چاہیئے تھا کہ میں روکڑ کی پروا نہیں کرتی
لیکن دیکھتی ہوں کہ جوں جوں تمھاری حیثیت بدل رہی ہے، تمھارا دل بھی بدل
رہا ہے۔ اس سے تو یہی اچھا تھا کہ تمھاری وہی حالت بنی رہتی۔ میں تمھارے
ساتھ فاقے کر سکتی ہوں۔ چیتھڑے پہن سکتی ہوں، لیکن یہ نہیں ہو سکتا
کہ تم چین کرو۔ اور میں میکے میں پڑی تقدیر کو رویا کروں۔ میری محبت
اتنی بے غرض نہیں۔"

اس وقت پریم چند سکول ماسٹر مقرر ہوئے تھے اور اٹھارہ روپے
ماہوار تنخواہ تھی۔ "مستعار گھڑی" کا ہیرو ہے۔ پریم چند نہیں ہے لیکن اس کہانی
میں اس کی اقتصادی حالت کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ پریم چند کی اپنی حالت
سے مختلف نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کہانی کا غریب ہیرو اپنے دوست
والوں سے گھڑی مانگ کر اور بن ٹھن کر سسرال گیا ہے۔ لیکن پریم چند نے شاید
کبھی ایسا نہ کیا ہو اور ممکن ہے کہ ایسا کیا بھی ہو۔ اور اس واقعے کے بعد

انھیں یہ نصیحت ہوئی ہو کہ دکھاوے اور نمود کی ہوس بے سود ہے۔ جب تم واقعی غریب ہو، تو غریب کہلانے میں شرم کیوں؟ اور یوں ہی امیر کہلانے سے حاصل!

اس کہانی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیوی اپنے میکے یا سوتیلی ساس کے پاس رہنے کی بجائے خود ان کے پاس آکر رہنا چاہتی تھی لیکن قلیل تنخواہ کے باعث پریم چند ایسا نہ کر سکے۔ لاچاری اور مجبوری تھی اور انہی لاچاریوں اور مجبوریوں کے باعث دلوں میں گرہ پڑتی رہی۔ اور رنجش بڑھتی گئی

"لعنت" کے کاؤس جی کی کہانی معمولی ردّ و بدل کے ساتھ پریم چند کی اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ غریب کاؤس جی کا امیر شاپور کی حالت سے یوں مقابلہ کیا ہے:

"کاؤس جی نے اخبار نکالا، اور شہرت کمانے لگے۔ شاپور جی نے روئی کی دلّالی شروع کی اور دولت کمانے لگے۔ کمائی دونوں ہی کر رہے تھے۔ لیکن شاپور جی خوش تھے، کاؤس جی دل گرفتہ۔ شاپور جی کو عزّت کے ساتھ دولت خود بخود مل رہی تھی۔ کاؤس جی کو شہرت کے ساتھ دولت دوربین سے دیکھنے پر بھی کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے شاپور جی کی زندگی میں سکون تھا، عافیت تھی، امید تھی، درد تھا اور چہل پہل تھی۔ کاؤس جی کی زندگی میں تلخی تھی، ناکامی تھی، مایوسی تھی، بے قراری تھی، بے دردی تھی۔ دولت کو حقیر سمجھنے کی وہ کوشش کرتے تھے، لیکن جو عیاں تھا اس کی جانب سے آنکھیں بند کر لینا غیر ممکن تھا۔ شاپور جی کے دولت کدہ میں جو فراخ دلی تھی اور مہمان نوازی اور شہ

تھی۔ اس کے مقابلے میں انھیں اپنے گھر کی بے سر و سامانی، تنگ دلی، نزاع
اور بدنظمی سے نفرت ہوتی تھی۔ شیریں بیان اور خوش خلق مسز شاپورجی کے
سامنے اپنی گلشن بانو کم ظرف اور حسد کی پتلی معلوم ہوتی تھی، جسے مہمانوں سے
گویا کوئی پرخاش ہو، جو سیدھی سی بات بھی کہتی تو طنز اور جگر خراش کنایوں
کے ساتھ۔ شاپورجی گھر میں آئے تو شیریں تبسم اور گرم جوشی سے اُن کا خیر مقدم کرتی
کاؤس جی خود تھکے ماندے، پریشان حال گھر آئے تو گلشن اپنا دکھڑا
سنانے بیٹھ جاتی اور ان کو خوب ملامت کرتی۔ تم بھی اپنے کو انسان کہتے
ہو، میں تمھیں بیل سمجھتی ہوں، نرا چار پیروں والا بیل، بیل بڑا غریب ہے
سیدھا ہے محنتی ہے، صابر ہے، مانا، پھر اسے شادی کرنے کا کیا حق ہے
کاؤس جی سے ایک لاکھ بار یہ سوال کیا جا چکا تھا جب تمھیں اخبار نکال کر اپنی
زندگی برباد کرنی تھی تو تم نے شادی کیوں کی۔ اپنے ساتھ مجھے کیوں لے
ڈوبے۔ جب تمھارے گھر میں دو روٹیاں نہ تھیں تو مجھے کیوں لائے۔ اس سوال
کا جواب دینے کی غریب کاؤس میں ہمت نہ تھی، نہ طاقت اور نہ صلاحیت
انھیں کوئی جواب بھی نہ سوجھتا تھا، وہ خود اپنی غلطی پر پچھتاتے تھے"

مگر پریم چند کے معاملے میں یہ غلطی خود انھوں نے نہیں بلکہ ان کے
والد منشی عجائب لال نے کی تھی، اور اس معاملے میں پریم چند نے اُن کی بات
ٹھیک ہی لکھا ہے کہ آخری عمر میں خود بھی ٹھوکر کھائی اور ایک دھکا دے کر
انھیں بھی گرا دیا۔ لیکن پریم چند غلطیوں پر صرف پچھتاتے رہنے اور مایوس
ہو جانے والے آدمی نہیں تھے۔ وہ انسانی کمزوریوں کو سمجھتے تھے اور یہی

جانتے تھے کہ محبت محض خلاء میں نہیں پل سکتی۔ اس کے لیے بھی غذا کی ضرورت ہے، اور شرافت یا کم ظرفی بھی انسان کی جبلت یا فطرت نہیں، ماحول کی پیداوار ہے۔ تلخی اور طعن و تشنیع کی طاقت خراب مادی حالات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے وہ تلخ کلامی کے لئے بیوی کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے تھے اور ہمیشہ مفاہمت اور مصالحت کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ لیکن مفاہمت کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتے دیکھ کر انھیں واقعی دکھ ہوتا تھا۔

مصالحت نہ ہو سکنے کی صورت میں ایک ہی چارہ کار رہ جاتا تھا، کہ وہ بیوی کو چھوڑ دیں اور اس سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کش ہو جائیں۔ پریم چند جیسے نیک نفس اور انسان دوست شخص کے لئے یکایک یہ قدم اٹھانا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس سماج میں عورت کو سب سے زیادہ مظلوم سمجھتے تھے اور وہ اپنے ناولوں اور کہانیوں میں عورتوں پر مردوں کی زیادتی کے خلاف احتجاج کرتے رہے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنی عورت سے ایک دم قطع تعلق کر لیں، اسی "لعنت" کہانی میں کاؤس جی بیوی کے ساتھ اپنی بے رخی اور بے اعتنائی پر پچھتاتے ہوئے سوچ رہے ہیں۔" ان کی حق پژوہی اور عالی النفسی کیا محض تحریروں کے لئے وقف ہے؟ محض ان کے لیے جو ان سے دور ہیں، بے تعلق ہیں؟"

بیوی کے متعلق ان کے دل میں سوال پیدا ہوتا تھا "چھوڑیں، نہ چھوڑیں" اور ایک عرصے تک اس کشمکش میں مبتلا رہے۔ ان کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے کے لئے مرد اور عورت کے تعلقات کے متعلق ان کے نظریے

کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس کے لئے صرف ایک دو مثالیں کافی ہوں گی۔ "لعنت" کہانی ہی کو لیجئے، اس میں انھوں نے اپنے نظریے کی خوب وضاحت کی ہے۔ اس کہانی میں ایک ٹکڑا دیکھئے۔ شاپور جی رات بھر رنگ رلیاں منانے کے بعد لوٹتے ہیں۔ وہاں کاؤس جی ملتے ہیں تو انھیں بتاتے ہیں کہ وہاں کھانے میں دیر ہوگئی۔ لیکن کاؤس جی نے جیساکہ اخبار نویسوں کا وطیرہ ہے کہ وہ بات ہی نہیں پوچھتے۔ چڑیوں کی طرح بات کی جڑ بھی کھود لیتے ہیں، دریافت کیا کہ "دعوت میں میزبان کون صاحب تھے؟"

جواب ملا "مس گوہر"

"مس گوہر"

"جی ہاں، وہی، آپ چونکے کیوں؟ کیا آپ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ دن بھر کے دردسر کے بعد مجھے تازہ ہونے کے لئے کچھ تفریح کی بھی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ زندگی عذاب ہو جائے۔"

کاؤس جی نے زاہدانہ استحکام کے ساتھ کہا۔ "میں اسے نہیں مانتا۔"

"کیوں؟"

اس لئے کہ میں کسی قسم کی نفسیاتی تفریح کو اپنی منکوحہ کے ساتھ بے انصافی سمجھتا ہوں۔"

شاپور جی ہنسے، ایک پرمعذرت انداز کے ساتھ بولے "وہی دقیانوسی خیال۔"

کاؤس جی نے جوش کے ساتھ کہا "آپ کو واضح ہونا چاہیے کہ آج کی

تہذیب ایک نسل پہلے کی تہذیب سے کہیں زیادہ قرینِ انصاف ہے۔ اب عورتوں کے حقوق اس حد تک پامال نہیں کئے جاتے۔ اب عورت کو مرد سے بازپرس کرنے کا حق ہے۔"

یہی نظریہ کچھ مزید وضاحت کے ساتھ "دو سہیلیاں" کہانی میں پیش کیا گیا ہے جس میں عورت کے مساوی حقوق کے علم بردار ونود کی شادی پڑھی لکھی لڑکی پدما سے ہوتی ہے، پدما خود پسند ہے اور وہ اپنی خود پسندی اور کوتاہ اندیشی سے خاوند کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے اور اسے جان بوجھ کر تنگ کرتی ہے۔ لیکن ونود ہمیشہ نباہے رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور بیوی کی ہر زیادتی نہ صرف برداشت کرتا ہے بلکہ بڑی آسانی سے درگذر کر دیتا ہے۔ لیکن پدما کا تکبر بڑھتا ہی جاتا ہے۔ مصالحت ممکن نہیں رہتی تو ونود گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور جاتے وقت بیوی کے نام جو خط چھوڑ جاتا ہے، اس کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:-

"مجھے جلنے کا ذرا بھی غم نہیں، کیونکہ میں جانتا ہوں تم خوش ہو گی جب تم میرے ساتھ سکھی نہیں رہ سکتیں تو میں زبردستی کیوں پڑا رہوں؟ اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ ہم اور تم الگ ہو جائیں۔ میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا۔ تم جیسی ہو ویسی ہی رہو گی۔ پھر سکھی زندگی کا امکان کہاں؟ میں بیاہ کو روحانی ارتقا کا ذریعہ سمجھتا ہوں، عورت مرد کے تعلقات کا اگر کوئی مطلب ہے، تو یہی ہے۔ ورنہ میں بیاہ کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بیاہ کا مقصد یہی اور صرف یہی ہے کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کی روحانی ترقی

میں منتظر ہوں۔"

ان الفاظ سے پریم چند کے دل کی ٹیس ظاہر ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ عورت مرد کی راہ میں رکاوٹ بنے اسی لئے دنیا یا نئی زندگی اور نئے نظام کی تمنا کرتے تھے جس میں میاں بیوی دونوں کی زندگی خوشیوں سے معمور ہو" میدانِ عمل" کے ہیرو امر کے الفاظ جو انہوں نے گھر سے الگ ہوتے وقت کہے تھے۔ پریم چند کی اپنی اس تمنا کی ترجمانی کرتے ہیں امر کہتا ہے "میں اب ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہا ہوں ....

جہاں عورت اپنے شوہر کو پستی اور زوال کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ اس کی زندگی کو مسرتوں سے معمور کرتی ہے۔"

ونود مندرجہ بالا خط میں مزید لکھتا ہے "میں دھرم اور نیتی کا ڈھونگ نہیں مانتا، صرف روح کی تسکین چاہتا ہوں۔ اپنے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی۔ زندگی کا مقصد یہی ہے، منتہا یہی ہے۔"

آخر کامُس جی کی کوشش بالنی سے اور ونود کی باہم مصالحت ہو گئی کیونکہ آخر ہار مانی اور بالفاظ دیگر کوشش بالنی نے بھی اعلان کیا —— آج سے میری زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے جس میں عیش و عشرت نہیں؛ خلوص اور روحانیت مقدم ہوگی۔"

لیکن پریم چند کی بیوی میں یہ شعور پیدا نہیں ہوا۔ اس لئے انھوں نے وہ قدم اٹھایا جو وہ اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں منشی دیا نرائن نگم لکھتے ہیں :-

"پریم چند اپنی زندگی امن و سکون سے بسر کرنا چاہتے تھے۔ وہ نہ خود کسی کے ساتھ سختی کرنا پسند کرتے اور نہ کسی کی کوئی کڑی بات برداشت کر سکتے تھے۔ نجی معاملات میں وہ ہمیشہ اعتدال پر قائم رہنا چاہتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی آزمائش شادی کے موقع پر ہوئی۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے ان کی پہلی بیوی بہت بدسلیقہ تھیں جس کی وجہ سے ان کی زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ آئے دن کے جھگڑوں کے علاوہ کچھ اور واقعات بھی پیش آئے جن کے سبب سے مصالحت کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ جب انھوں نے مجھے مفصل حالات بتلائے تو میں بھی انھیں الزام نہ دے سکا۔ اتفاق سے اس بارے میں ان کا ایک خط محفوظ رہ گیا ہے جس پر کوئی تاریخ نہیں ہے۔ یہ یقیناً ۱۹۰۵ء کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

"برادرم، اپنی بپتا کس سے کہوں۔ ضبط کئے کئے کوفت ہو رہی ہے۔ جوں توں کر کے ایک عشرہ کاٹا تھا کہ خانگی تردّدات کا تانتا بندھا..... بیوی صاحبہ نے ضد پکڑی کہ یہاں نہ رہوں گی، میکے جاؤں گی۔ میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ ناچار کھیت کا منافع وصول کیا۔ ان کی رخصتی کی تیاری کی وہ رو دھو کر چلی گئیں۔ میں نے پہنچانا بھی پسند نہ کیا۔ آج ان کو گئے آٹھ روز ہو گئے، نہ خط نہ پتر۔ میں اُن سے پہلے ہی ناخوش تھا اب تو صورت سے بیزار رہوں، غالباً آپ کی ان کی جدائی دائمی ثابت ہو۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں بلا بیوی کے رہوں گا۔ ادھر ننہال کی طرف سے اور والدہ کی طرف سے ضد ہے کہ بیاہ رچے اور ضرور رچے۔ جب کہتا ہوں مفلس

ہوں .... نور والدہ کہتی ہیں کہ تم اپنی رضامندی دے دو۔ تم سے ایک کوڑی نہ مانگی جائے گی۔ بہرحال اب کی تو مُکلا چھڑا ہی لوں گا۔ آئندہ کی بات نارائن کے ہاتھ ہے۔ جیسی آپ کی صلاح ہوگی ویسا کروں گا۔ اس بارے میں ابھی پھر مشورہ کرنے کی ضرورت باقی ہے۔"

اس خط میں سوتیلی ماں کا ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ بیوی سے زیادہ ان کی چاچی یعنی سوتیلی ماں سے پٹتی تھی اور اس سے پہلی سی کدورت نہ رہ گئی تھی۔ "خانہ داماد" کہانی میں سوتیلی ماں کے بارے میں یہی رائے ظاہر کی گئی ہے۔ ایک کسان ہری دھن سے کہتا ہے، "تم نئی اماں سے ناحق (ناحق) ڈرتے تھے۔ بڑی سیدھی ہیں بے چاری، بس اپنی اماں ہی سمجھو۔ تمھیں پا کر تو نہال ہی ہو جائیں گی۔"

ہری دھن سوتیلی ماں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لئے سسرال میں جا کر رہنے لگا۔ جو روپیہ پیسہ ساتھ لے گیا تھا اس کے ختم ہونے پر ساس، سالے اور خود اس کی بیوی گمانی اس سے نفرت کرنے لگی۔ سارا دن گھر کا اور باہر کا کام کرتا تھا۔ پھر بھی نوکروں سے بدتر سلوک ہوتا تھا اور پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ عاجز آ کر اس نے سسرال کا گھر چھوڑ دیا، بیوی سے ساتھ چلنے کو کہا، لیکن وہ مفلس خاوند کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہوئی۔ یہی کسان جو ہری دھن کو سسرال سے آتے ہوئے راستے میں مل گیا تھا پوچھتا ہے ——

"اچھا گھر والی کو بھی تو لاؤ گے؟"

ہری دھن۔ اس کا منہ اب نہ دیکھوں گا، میرے لئے وہ مر گئی۔

منگرو۔ (کسان کا نام) ۔ تو دوسری سگائی ہو جائے گی ۔ اب کے ایسی عورت لاؤں گا کہ اس کے پیر دھو کر پیو گے ۔ پر کہیں پہلی آ گئی تو وہ ہری دھن ۔ وہ نہ آئے گی ۔

پریم چند نے بھی دوسری شادی کر لی ۔ لیکن دوسری شادی میں بھی انھوں نے جس اصول پرستی کا ثبوت دیا تھا ، قابل تعریف ہے ۔ دیا نرائن نگم لکھتے ہیں :-

"............ شادی کے متعلق بڑے غور و خوض اور بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد انھوں نے طے کیا کہ دوسری شادی طے کی جائے تو کسی بیوہ ہی سے کی جائے ۔

پریم چند کا اس وقت عالم شباب تھا اور وہ ایک ہنس مکھ ، زندہ دل ، خوش رو و تندرست اور کھاتے پیتے نوجوان تھے ۔ سری واستو فرقہ میں جس سے اُن کا تعلق تھا ۔ قرارداد کی رسم عام ہے ۔ اور ہزار دو ہزار نقد تو اُن کو آسانی سے مل سکتا تھا اور یہ رقم اس وقت تک ان کے لئے ایک بڑی رقم تھی ۔ اُن کے اہل خاندان بیوہ بیاہ کے خلاف تھے ۔ مگر وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہے ۔ اور ضلع فتح پور میں موضع سلیم پور (کنوارا) میں شریمتی شورانی دیوی کے ساتھ اُن کی دوسری شادی ہو گئی ...."

شریمتی شورانی دیوی کی شادی اتنی چھوٹی عمر میں کر دی گئی تھی کہ وہ بچپن ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں ۔ شورانی دیوی اب بھی زندہ ہیں اور بڑی اچھی عورت ہیں ۔ پریم چند کی ان سے خوب نبھی ۔ مگر پہلی بیوی جتنا عرصہ زندہ رہیں وہ اُسے ماہانہ خرچ بھیجتے رہے مگر قطع تعلق ہو جانے کا انھیں ساری عمر رنج

ہی رہا۔ کیونکہ مندرجہ بالا دونوں کہانیاں "لعنت" اور "دو سہیلیاں" ان کے آخری دور کی تصنیف ہیں۔ جو مصالحت حقیقی زندگی میں نہ ہوئی وہ تخیل کی دنیا میں ـــــ ان کہانیوں میں کی گئی ہے۔ اس سے یقیناً اُن کے ذہن کو تسکین حاصل ہوئی ہوگی۔ شورانی دیوی نے بھی کوشش کی کہ وہ پہلی بیوی کو بھی لے آئیں۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ اپنی خوشی سے وہ نہ آئیں اور بلانے پریم چند نہیں گئے۔

پریم چند نے ایک کہانی "نیا بیاہ" عنوان سے بھی لکھی ہے۔ اس کا پلاٹ اگرچہ مختلف ہے۔ لیکن بیاہ کے متعلق پریم چند کا نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔ پہلی بیوی لیلا سے سیٹھ جی کی طبیعت نہ بھری، دوسری بیاہ لائے۔ کم سن آشا انھیں دادا سے کم نہیں سمجھتی اور انھیں آپ کہہ کر پکارتی ہے۔ اس پر سیٹھ جی اعتراض کرتے ہیں۔

تم مجھے "آپ" کیوں کہتی ہو۔ میں اپنے گھر میں دیوتا نہیں چنچل بالک بننا چاہتا ہوں .... آشا نے جیسے اندر سے زور لگا کر کہا "تم" اور اس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔

پریم چند اس قسم کی شادیوں کی ہمیشہ مذمت کرتے تھے۔ بیوہ سے شادی کر کے انھوں نے ذہنی ہم آہنگی پیدا کی اور اپنے گھر میں چنچل بن کر رہے شورانی دیوی کے ساتھ ان کی گھریلو زندگی کا ذکر آگے آئے گا۔ اب ذرا اسی "نیا بیاہ" کہانی کا ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو :-

" بیاہ کیا ہے زندگی کا لطف اُٹھانے کے لئے جھلملاتے ہوئے

چراغ میں تیل ڈال کر اسے اور تیز کرنا ہے۔ اگر چراغ کی روشنی تیز نہ ہو تو تیل
ڈالنے سے کیا فائدہ؟"

50/-

"استعفیٰ"

ہمارے غیر معمولی کام فیصلوں سے نہیں
ہوا کرتے۔ ہم آخر وقت تک پیش و
پنج میں رہتے ہیں۔ (پریم چند)

ہمیرپور میں پریم چند اکثر بیمار رہتے تھے۔ وہاں کھانے پینے کا ٹھیک انتظام نہیں تھا جس کی وجہ سے انھیں ایک مرتبہ کئی روز تک خشک ارد کی کھانی پڑی۔ ایک دن پیٹ میں ایسا درد ہوا کہ تمام دن مچھلی کی طرح تڑپتے رہے، لکھتے ہیں —— "چورن کھایا، پیٹ پر گرم بوتل پھیری، جامن کا عرق پیا، غرض دیہات میں جتنی دوائیں مل سکتی تھیں سب کھائیں۔ لیکن درد کم نہ ہوا۔ دوسرے دن پیچش ہو گئی۔ لیکن درد جاتا رہا۔"

1

پریم چند اچھا کھانا سامنے دیکھ کر ضبط نہ کر سکتے تھے۔ اس واقعے کے ایک ماہ بعد جب وہ دورے پر تھے تو ایک تھانہ میں ٹھہرنا ہوا۔ داروغہ نے اُن کی خوب آؤ بھگت کی۔ زمین قند پکوایا، دہی بڑے، پکوڑیاں، پلاؤ سب کچھ بنوایا اور پریم چند نے بھی خاص طور پر کھایا۔ لیکن جب کھا پی کر سوئے تو ڈھائی گھنٹے بعد ہی پیٹ میں شدید قسم کا درد پیدا ہو گیا سوڈے کی دو بوتلیں پینے کے بعد قے ہوئی، تب کہیں درد کو آرام ہوا، لیکن پیچش کی دائمی شکایت رہنے لگی۔ یہ ساری زمین قند کی خرابی تھی۔ اس روز سے پریم چند زمین قند اور اروی کے پاس تک نہیں پھٹکے، صورت دیکھ کر کانپ جاتے تھے۔

پریم چند نے اس مرض کے باعث ۱۹۱۴ء میں تبادلے کی درخواست دی، خیال تھا کہ کسی اچھی جگہ تبادلہ ہو گا لیکن انھیں بستی کے ضلع میں پٹکا گیا، یہ حلقہ نیپال کی ترائی کے قریب ہے، یہاں آکر پیچش کی شکایت اور بڑھ گئی، اور پھر دور دراز علاقے میں پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت بھی نہ رہی۔ لیکن ڈمریا گنج کے تحصیل دار پنڈت منن دویدی گجپوری زندہ دل آدمی تھے ادب اور علمی مسائل سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ پریم چند اور ان میں خوب علمی مباحث رہتے تھے۔ یہیں سے انھوں نے "انا تھ لڑکی" "خون سفید"، "شکاری اور راج کمار"، "شامتِ اعمال" "غیرت کی کٹار" اور "مرہم" وغیرہ کہانیاں لکھیں۔ ان قصّوں کا مواد تاریخ سے حاصل نہیں کیا گیا۔ لیکن اس زمانے کا ذوق علمیت اور تجسّس جھلکتا ہے۔

پیچش آخر ناقابل برداشت ہوگئی۔ تب وہ چھ ماہ کی چھٹی لے کر لکھنؤ آئے اور میڈیکل کالج میں علاج کراتے رہے۔ کچھ فائدہ نہ ہوا تو بنارس آکر ایک حکیم کا علاج شروع کیا۔ تین چار مہینے کے مسلسل علاج سے فائدہ تو ہوا، لیکن بیماری جڑ سے نہیں گئی، کیونکہ جب چھٹی ختم ہونے پر واپس بستی میں آئے تو پھر وہی حالت ہوگئی، اُن کے لئے دوروں پر جانا ممکن نہیں رہا، اس لئے مدرسی پر جانے کی درخواست دی۔

اس کے علاوہ گھر کے تردداتِ بھی بڑھ گئے تھے۔ پہلے ان کے ایک عزیز جے نارائن لال اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ انھیں لکھنے پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ پریم چند کو اُن کا بڑا سہارا تھا گو انھیں اکثر دورے پر رہنا پڑتا تھا۔ لیکن ان کی وجہ سے گھر کی طرف سے بے فکر رہتے تھے، لیکن وہ خفیف علالت کے بعد مہوبا ہی میں چل بسے۔ ۱۹۱۵ء میں ایک دوست کو مہوبا سے ایک خط میں لکھا :۔

"اس صدمے سے کمر ٹوٹ گئی، ہمت پست ہوگئی۔ جس انسپکٹری کو بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد حاصل کیا تھا وہی اب جی کا جنجال ہو رہی ہے۔ بیوی کو تنہا چھوڑ کر دورے پر کیسے جاؤں ...."

جولائی ۱۹۱۵ء میں وہ گورنمنٹ اسکول بستی کے اسسٹنٹ ٹیچر مقرر ہوگئے اور تین سال تک وہیں قیام رہا۔ دوروں سے فرصت پاکر وہ ادب اور تصنیف کی طرف زیادہ مائل ہوئے "سرِ پُر غرور"، "دھوکا"، "دو بھائی"، "بیٹی کا دھن"، "پنچایت"، "جگنو کی چمک" اور "شعلۂ حسن"

وغیرہ کہانیاں ان دنوں لکھیں۔ ان کہانیوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام سے ان کا تعلق گہرا ہوگیا تھا اور اُن کی اچھائی اور عظمت میں اُن کا اعتماد بہت بڑھ گیا تھا۔

اگست ۱۹۱۶ء میں وہ بستی سے گورکھپور آئے وہاں ان کا تعارف مہابیر پرشاد پودار سے ہوگیا۔ وہ ہندی لٹریچر کے بڑے عالم، دیش بھگت اور بڑے جفاکش و محنتی شخص تھے۔ پریم چند نے ان کی صحبت سے کافی فیض حاصل کیا۔ ان دنوں پریم چند نے خود بھی ہندی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا ناول "سیوا سدن" (بازارِ حسن) جو غالباً ۱۹۱۴ء میں چھپا تھا بہت مقبول ہوا۔ اس سے پہلے بھی ہندی میں ان کی کچھ کہانیاں اور دو تین ناول چھپ چکے تھے لیکن "سیوا سدن" لکھ کر انھوں نے اپنا لوہا منوا لیا۔

اس مقبولیت اور حوصلہ افزائی سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنا پہلا طویل ناول "پریم آشرم" یعنی گوشۂ عافیت لکھنا شروع کیا۔ اس ناول میں اس زمانے کے دیہات کی صحیح اور پوری تصویر آجاتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ پریم چند کو اپنے دیس کے غریب اور بے کس کسانوں سے کتنی ہمدردی تھی، اور وہ کس طرح اُن کے لیے سوراج اور خوش حالی کے خواب دیکھتے تھے۔

انگریزی سامراج کی لوٹ کھسوٹ کے باعث ہمارے دیہاتوں کا پرانا ڈھانچہ بالکل ٹوٹ گیا تھا اس سے پہلے بھی حکومتیں بدلیں، لیکن ان کا دیہات پر کچھ اثر نہیں پڑا، اگر پڑا تو بالکل معمولی۔ انھیں حکومت سے کوئی تعلق نہیں

تھا وہ الگ تھلگ رہتے تھے جس کی وجہ سے اُن میں قدامت پسندی، اور توہم پرستی ضرور پیدا ہوگئی تھی لیکن ایک طرح کی خوش حالی اور خود کفالتی تھی۔ پھر آپس کا میل جول، اتحاد اور فطری محبت اور عظمت تھی۔

انگریزی سامراج یہاں تجارت کی غرض سے آیا تھا۔ چنانچہ دیہات انگریزی تاجروں کی دست برد سے نہ بچ سکے۔ تجارت کو فروغ دینے اور حکومت کو اچھی طرح چلانے کی غرض ہی سے نقل و حرکت کے سلسلوں میں توسیع کی گئی۔ ریل، ڈاک اور تار کے محکمے قائم کئے گئے۔ ان سب چیزوں کا اثر دیہاتی زندگی پر پڑا۔ ظاہر ہے کہ اب وہ الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے، ان کی خود کفالتی بھی ختم ہوگئی۔ یہ ایک طرح اچھا ہی تھا۔ کیونکہ اس سے تہذیب کی نئی قدریں بنتیں، ان کی توہم پرستی ٹوٹتی۔ مشینوں کے ساتھ جو نئی تہذیب آئی تھی، دیہاتی بھی اس سے روشناس ہوتے۔

لیکن انگریزوں نے یہ سب کچھ نہیں ہونے دیا۔ سارے ملک کو اپنے تسلّط میں لاکر دیہات میں پرانا جاگیرداری نظام قائم رہنے دیا۔ ہندوستان میں مشینی صنعت کا تو ذکر ہی کیا۔ دیہات میں جو گھریلو صنعتیں اور دستکاریاں تھیں، انھیں بھی تباہ کر دیا۔ ہندوستان کو برطانیہ میں چلنے والے کارخانوں کے لیے صرف کچا مال مہیا کرنا ہوتا تھا، جو انگریز حکمران طبقہ بہت سستے داموں لیتا تھا اور اس کے مقابلے میں برطانیہ کا بنا ہوا مشینی مال بہت مہنگا بکتا تھا۔ جس کی وجہ سے کسانوں کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ خود برطانوی ماہرین اقتصادیات کا کہنا ہے کہ انیسویں صدی

اُنیسویں اور بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان کی پہلی خوش حالی ضائع ہو گئی تھی اور دیہات کی حالت بہت خستہ تھی۔ رجنی پام دت اپنی کتاب "نیا ہندوستان" میں اس حالت کے متعلق ایک انگریز مؤرخ ایم۔ ایل ڈارلنگ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے بارے میں سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس کی مٹی زرخیز ہے اور اس کے باشندے مفلس۔"

اس کے علاوہ ان پر براہِ راست پڑنے والے ٹیکسوں کا بار بھی بڑھ گیا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں جن لوگوں کو زمین کا لگان وصول کرنے کے لئے علاقوں کے مختار مقرر کیا گیا تھا انگریزوں نے انھیں زمیندار بنا دیا۔ اس سے ان کی سلطنت کی جڑیں مضبوط ہوتی تھیں۔ یہ لوگ زمین کے مالک تھے کسان مزارعے تھے۔ زمیندار طرح طرح کے کر اور ٹیکس وصول کرتے تھے۔ مختار اور گماشتے کسانوں کو الگ لوٹتے تھے۔ اس کے علاوہ سرکاری افسر ڈپٹی کمشنر سے لے کر تحصیلدار تک دیہات کو اپنی لوٹ کھسوٹ سے مفلس بنا رہے تھے۔ پٹواریوں، چھوٹے پیادوں اور چوکیداروں کا تو ذکر ہی کیا، وہ تو کسان کے جسم سے مستقل طور پر چمٹی رہنے والی جونکیں تھیں ایسے میں پھر کسان کیسے پنپ سکتا تھا۔ اس کی مصیبتوں کا کیا ٹھکانا معمولی معمولی خواہشات دل ہی گھٹ کر رہ جاتی تھیں۔ اس کی نا آسودہ تمنائیں اس کی شخصیت کو کچل رہی تھیں اور دل میں جو لا لکھی پلتا رہتا تھا۔

ان باتوں کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ اس پس منظر کو مدِنظر رکھ کر

پریم چند کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ چونکہ وہ دیہات میں پیدا ہوئے تھے
اور اب دورہ کے باعث اکثر دیہات میں رہنا ہوتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے دیس
کے دیہاتی عوام سے اور اُن کی مشکلات سے اچھی طرح روشناس ہو گئے تھے
بقول شخصے انھوں نے اپنے عوام کو سونگھ کر دیکھا تھا، انھیں اچھی طرح پہچان
لیا تھا۔

ملازمت کے باعث ان کا واسطہ حکام سے اور پڑھے لکھے طبقے سے
بھی پڑتا تھا۔ اپنے عوام سے اُن کی سرد مہری اور بے دردی دیکھ کر پریم چند
کو بڑا رنج ہوتا تھا۔ کیا جج، کیا وکیل، اور کیا ڈاکٹر سب پیسوں کے لئے غریبوں
کا گلا کاٹنے والے، پیسے کے لئے ضمیر کا خون کرنے والے، نفس پرست اور
خود غرض لوگ تھے۔ میدانِ عمل میں لکھتے ہیں ــــ "اتنی عدالتوں کی کیا
ضرورت ہے۔ اتنے محکمے کس لئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غریبوں کی لاشیں نوچنے
والے گدھوں کا غول ہے۔ جس کی تعلیم جتنی اونچی ہے۔ اس کی حرص اسی مناسبت
سے بڑھی ہوئی ہے۔ اگر اس دنیا کو انسان نے بنایا ہے تو انصاف کا خون
کیا ہے۔ خدا نے بنایا ہے تو اسے کیا کہیں۔"

ملازمت کے زمانے میں یہ احساس پریم چند کے دل میں بڑی شدت
سے پیدا ہو گیا تھا۔ عدالت، افسر اور زمیندار اور ان کے پیادے سب
کسانوں کو لوٹتے تھے۔ اور پھر سود خور مہاجن تھے جن کی پشت پناہ بھی
یہی سرکار اور عدالتیں تھیں۔ ایک طرف غریب کسان تھے جو دن رات
محنت کرتے تھے اور پوری تندہی سے تخلیقی عمل میں منہمک تھے۔ دوسری

طرف خود غرض اور نکمے لوگوں کا یہ غول تھا جو کسانوں کی ہڈیاں تک چبا جانے کے لئے گدھوں کی طرح ان کے سروں پر منڈلاتا رہتا تھا۔ پھر اس کے بعد پہلی عالم گیر جنگ شروع ہو گئی۔ جنگ کی تباہ کاریاں صرف یہی نہیں کہ بیش قیمت انسانی جانیں تلف ہوتی ہیں، ہزاروں لاکھوں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوتی ہیں۔ خوب صورت شہر اور عمارتیں اجڑ جاتی ہیں، ادب اور تہذیب کے خزانے، لائبریریاں خاک میں مل جاتی ہیں، بلکہ تمام محنت کش طبقہ پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ حکومت نوٹ چھاپ کر اس کی محنت پر ڈاکہ ڈالتی ہے مشینی مال اور بھی مہنگا ہو جاتا ہے۔ گو جنگ میں اناج کے دام بھی بڑھے تھے، لیکن اس سے زمینداروں اور امیر کسانوں کو فائدہ پہنچا تھا۔ لیکن غریب کسانوں اور مزارعوں کا مہنگائی کے مارے کچومر نکل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے باعث ملک میں آزادی کی جنگ بھی تیز ہو گئی۔ ہر ایک جنگ جہاں عوام کا کچومر نکالتی ہے وہاں انھیں بیدار بھی کرتی ہے۔ بقائے حیات کے لئے جدوجہد تیز ہو جاتی ہے۔

پریم چند نے لوٹ کھسوٹ کے اس نظام کو پوری طرح سمجھ لیا تھا اُن کی ہمدردی ہمیشہ عوام کے ساتھ رہی۔ وہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے بھی کبھی حاکم طبقے کے ساتھی نہیں بنے۔ پڑھے لکھے طبقے کے جو خود غرض لوگ عام طور پر عوام کو جاہل، بے وقوف اور غلیظ کہہ کر نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ پریم چند انھیں بہت ہی ذلیل اور کمینے سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے عوام کی بے لوث محبت، قربانی، ایثار اور مصیبتیں برداشت کرنے کی

صلاحیت کو سمجھ لیا تھا۔ وہ ہمیشہ اُن کی عظمت کو اُبھارتے اور محرک کرتے تھے۔ اگر ان میں کچھ کمزوریاں تھیں تو یہ اُن کی اپنی نہیں تھیں، نظام کی پیدا کردہ تھیں۔ اپنی ایک کہانی "موٹھ" میں لکھتے ہیں —— "جس کا خانۂ آرزو ہمیشہ اندھیرا رہا ہو جس کی خواہشیں کبھی مسکرائی نہ ہوں اس کی نیت خام ہو جائے تو تعجب کی بات نہیں۔"

یہ حقیقت ان کی تمام کہانیوں اور ناولوں میں کارفرما ہے، وہ کبھی فطری تقاضوں سے انحراف نہیں کرتے۔ وہ انسانی کمزوریوں کو سمجھتے ہیں۔ اور اُن سے بے پایاں ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور جو سماج اِن کمزوریوں کے لئے ذمے دار ہے۔ اس پر ہر پہلو سے بھرپور چوٹ کرتے ہیں۔ انھی دنوں کی ایک کہانی "اناتھ لڑکی" ہے۔ اس کا ایک کردار کہتا ہے:۔

"باپ قرض کھا کر مر جائے، لڑکا کوڑی کوڑی بھرے، علماء کے نزدیک یہ انصاف ہے۔ میں اسے ظلم کہتا ہوں۔ اس انصاف کے پردے میں گانٹھ کے پورے مہاجن کی دست درازی صاف نظر آتی ہے۔"

چند فقروں میں روایت، حکومت، مذہبی ریاکاری اور سود خوری سب کو تاڑ دیا۔ سماجی، سیاسی اور اقتصادی قوتوں اور اُن کے باہمی گٹھ بندھن کو سمجھ لینے کے بعد ہی یہ شعور پیدا ہوتا ہے۔ "پریم آشرم" یعنی "گوشۂ عافیت" میں پریم چند نے اس بیدار شعور کے ساتھ زندگی کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

یہ ناول "بازارِ حسن" یعنی سیوا سدن سے دو قدم آگے جاتا ہے

اس ناول میں اقتصادی مسائل سے اچھی طرح بحث کی گئی اور طبقاتی کش مکش پوری شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اس میں دو طرح کے کسان دکھائے گئے ہیں۔ ایک سمجھوتہ کرنے والے ہیں اور دوسرے لڑنے والے لیکن لوٹ کھسوٹ سے دونوں ہی عاجز آچکے ہیں۔ لاوا اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ لگان وصولی کے دنوں میں زمیندار کے کارندوں کی زیادتیاں سہہ کر بغاوت کا جذبہ انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔ انھی دنوں لڑاکو کسانوں کے رہنما منوہر کو پتہ چلتا ہے کہ زمیندار گیان شنکر کے کارندے غوث خاں نے ان کی بیوی کی بے عزتی کی ہے۔ وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اس کے اندر کا لاوا پھوٹ نکلتا ہے۔ اقتدار پسند طبقے اور اس کی پشت پناہ حکومت نے اس کے اندر جو جھجک پیدا کر رکھی تھی وہ ایک دم دور ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے بلراج کو سمجھاتا ہے:۔

"کوئی پروا نہیں کلہاڑا ہاتھ میں لیے تو سب ٹھیک ہو جائے گا تم میرے بیٹے ہو، تمھارا کلیجہ مضبوط ہے، تمھیں ابھی جو ڈر لگ رہا ہے وہ تاپ کے پہلے کا جاڑا ہے۔ تم نے کلہاڑا کندھے پر رکھا۔ مہابیر کا نام لے کر ادھر چلے تو تمھاری آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں گی!"

اب غوث خاں کے قتل کے بعد نہ صرف منوہر لال اور اس کے بیٹے کو بلکہ تمام گاؤں کو باندھ لیا جاتا ہے۔ زمیندار گیان شنکر اور اس کی امداد کرنے والی سرکاری فوج اس کے بعد کسانوں پر جو ظلم ڈھاتی ہے، خود غرض ڈاکٹر اور وکیل جو جھوٹی شہادتیں دیتے ہیں۔ اس سے تمام سماج دو طبقوں میں

منقسم ہوا صاف نظر آتا ہے اس ظلم کو دیکھ کر کسانوں کے دل کانپ جاتے ہیں
اور وہ منوہر کو لعنت ملامت کرتے ہیں۔ اس موقع پر سب سے دانش ور
اور نرم دل کسان قادر اُن سے کہتا ہے :-

"یارو ایسی باتیں نہ کرو، بے چارے نے تم لوگوں کے لئے، تمھارے
حقوق کی حفاظت کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اس کے جھوٹ اور ہیاؤ کی
تعریف تو نہیں کرتے الٹا اس کی برائی کرتے ہو۔ ہم سب کے سب ڈرپوک
ہیں، وہی ایک مرد ہے"

یہ قادر کی آواز پریم چند کی اپنی آواز ہے۔ یہی آواز آگے چل کر باعمل
ہو جاتی ہے اور پریم چند اس جد و جہد میں پوری طرح کسانوں کا ساتھ دیتا
ہے۔ گاؤں کی عورتیں منوہر کی بیوی بلاسی کو طعنے دیتی ہیں کہ تو نے ہمارے
گاؤں کا ستیاناس کرایا۔ تو اگر ذرا غم کھا جاتی منوہر سے شکایت نہ کرتی تو
گاؤں پر یہ تباہی تو نہ آتی۔ بلاسی بے چاری مخمصے میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ سوچتی
ہے کہ شاید واقعی برا ہوا، زمیندار اور حکومت کا مقابلہ کون کرسکتا ہے
لیکن اس موقع پر سکھو چودھری آپہنچتا ہے اور وہ بلاسی کی ڈھارس بندھاتے
ہوئے کہتا ہے کہ تیرا منوہر سورما ہے۔ اس نے گاؤں کی مریاد بچائی ہے
میں یہاں ایک مینار بنواؤں گا جس میں منوہر کی مورتی لگائی جائے گی
اس سے بلاسی کو منوہر کے فعل کی صداقت اور عظمت کا یقین ہو جاتا ہے
اور وہ فخر سے گردن بلند کر لیتی ہے۔

غوث خاں کے بعد فیض خاں کو نیا کارندہ مقرر کر دیا گیا ہے وہ اب

گاؤں پر طرح طرح کے ظلم ڈھا رہا ہے۔ وہ لگان وصولی کی قرقی لے آیا ہے اور سب کچھ قرق کر رہا ہے۔ سکھو چودھری اُسے لگان کا روپیہ دے کر ظلم بند کرانا چاہتا ہے تو وہ عدالت کے خرچے کے نام پر بڑی رقم طلب کرتا ہے۔ اب پریم چند لکھتے ہیں:-

"سنیا گرہ میں تشدد کو مغلوب کرنے کی طاقت ہے۔ یہ خیال غلط ثابت ہوا"۔ اور

"دفعتاً چودھری نے اپنا چمٹا اُٹھایا اور اتنی زور سے فیض اللہ کے سر پر مارا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ پھر بولے یہی عدالت کا خرچہ ہے۔ جی چاہے اور لے لو۔ بے ایمان، پاپی کہیں کا، کارندہ بنا پھرتا ہے ...."

پریم چند کے ذہن میں یہ جدوجہد چل رہی تھی۔ "بازار حسن" میں وہ بالکل اصلاح پسند تھے۔ ساری کانگریس تحریک اصلاح پسند تھی گاندھی سے پہلے بھی کانگریس کے جو رہنما تھے وہ بھی سماج کو بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی لڑائی سماج کے طبقاتی ظلم کے خلاف نہیں بلکہ صرف انگریزی سامراج کے خلاف تھی۔ انگریزوں نے اگر ملک کو مفلس بنا دیا تھا تو وہ انگریزوں سے پہلے کے ہندوستان کو "سونے کی چڑیا" کہہ کر اور دودھ کی نہروں کی کہانیاں سنا کر یہ غلط تصور پیدا کر رہے تھے کہ صرف انگریزوں کو ہٹا دینے یا اُن سے کچھ مراعات حاصل کر لینے ہی سے پھر پرانی خوش حالی لوٹ آئے گی۔ لیکن پریم چند صرف اتنی سی تبدیلی کو اس بیماری کا علاج نہیں سمجھتے تھے ان میں اس وقت بالکل نیا شعور پیدا ہو رہا تھا۔ وہ بغاوت کی راہ پر چل رہے

تھے۔ اُن میں جو ذہنی تبدیلیاں ہو رہی تھیں وہ تبدیلیاں انھوں نے اس ناول کے اصلاح پسند اور انسان دوست کردار پریم شنکر میں ظہور پذیر ہوتے دکھائی ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"زندگی انھیں نئے نئے تجربات کا مکتب نظر آتی تھی "

"زندگی کے تجربے نے انھیں سکھایا کہ اصولوں کی بہ نسبت انسان زیادہ قابلِ عزت ہے "

صاف ظاہر ہے کہ پریم چند کے پرانے تصوّرات ٹوٹ رہے تھے، انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ سماج کے اصول کوئی ازل سے بندھے ٹکے اصول نہیں سماج کے اقتصادی ڈھانچے کے ساتھ وہ بھی بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ جن دنوں انھوں نے یہ ناول لکھا انھیں دنوں انھوں نے ایک کہانی "قربانی" لکھی تھی جو ۱۹۱۹ء میں "زمانہ" میں چھپی تھی۔ کہانی کا آغاز یوں ہوتا ہے:۔

"انسان کی حیثیت کا زیادہ اثر غالباً اس کے نام پر پڑتا ہے۔ منگرو ٹھاکر جب سے کانسٹبل ہو گئے ہیں، ان کا نام منگل سنگھ ہو گیا ہے۔ اب انھیں کوئی منگرو کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کلّو اہیر نے جب سے تھانہ دار صاحب سے دوستی کی ہے اور گاؤں کا مکھیا ہو گیا ہے اس کا نام کالکا دین ہو گیا ہے۔ اس طرح ہرکھ چند کورمی اب ہرکھو ہو گیا "

ہرکھو کی دولت اور کھیت ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ یہ سماج کے خصوصاً درمیانہ طبقے کے بننے بگڑنے کی صحیح تصویر ہے۔ پریم چند کیسے بوسیدہ اصولوں پر کاربند رہتے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اتنی بڑی جنگ

لڑائی گئی تھی، روس میں انقلاب آگیا تھا۔ دنیا کے ایک وسیع خطے کو لوٹ کھسوٹ کے نظام سے نجات ملی تھی۔

پریم چند جو قدم قدم پر حالات کا جائزہ لیتے رہتے تھے روس کے اکتوبر انقلاب سے متاثر ہوئے کیونکہ "پریم آشرم" کا بلراج جو اخبار وغیرہ پڑھنے کا عادی ہے۔ وہ سرکاری ملازموں کے مقابلے میں گاؤں والوں کی حمایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم کیوں کسی کی دھونس سہیں۔ روس میں کسانوں، مزدوروں نے اپنا راج قائم کر لیا ہے۔

اس قسم کا انقلاب پریم چند اپنے ہاں چاہتے تھے۔ اس ناول کے آخیر میں انھوں نے گاؤں کی جو دلکش تصویر کھینچی ہے وہ یقیناً انقلاب کے بعد کا نقشہ ہے۔ پریم چند کا حسین خواب ہے۔

لیکن پریم چند باعمل آدمی تھے وہ جو خواب دیکھتے تھے اُسے پورا کرنے کے لئے جدوجہد کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اصلاح پسندی چھوڑ کر انقلاب کے داعی بن گئے انقلابی اگر بنے نہیں تھے تو بن ضرور رہے تھے۔ انھوں نے خود اپنا ہی تجزیہ کرنے کے بعد یہ بات لکھی ہے کہ "ستیاگرہ میں تشدد کو مغلوب کرنے کی طاقت ہوتی ہے، یہ خیال غلط ثابت ہوا!"

کسانوں پر جو ظلم ہو رہا تھا اس کا علاج ستیاگرہ نہیں تھا اور ایک منوہر کے ایک غوث خاں کو قتل کر دینے سے بھی کچھ نہیں بنتا تھا۔ اس کے لئے ایک مجموعی جدوجہد کی ضرورت تھی۔ اور جب اس جدوجہد کا وقت آیا تو پریم چند نے جھٹ ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور وہ عملی طور پر

جدو جہد میں شریک ہو گئے۔

منشی دیا نارائن نگم لکھتے ہیں کہ انھوں نے استعفیٰ فروری ۱۹۲۱ء میں دیا۔ لیکن پریم چند خود اپنے مضمون میں استعفیٰ کا ذکر یوں کرتے ہیں

.... یہ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں تحریک عدم اشتراک عمل زوروں پر تھی۔ جلیان والہ باغ کا واقعہ ہو چکا تھا۔ انھی دنوں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا۔ غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا۔ دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ تمام ضلع کی عقیدت مند پبلک دوڑی آئی تھی۔ ایسا مجمع اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا دیکھا تھا۔ مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی کے دل میں بھی جان آگئی۔ اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔"

سماجی اور سیاسی شعور رکھنے پر بھی استعفیٰ دینے کا کام اتنی آسانی سے نہیں ہو جاتا۔ بیس سال کی ملازمت کو ایک دم ٹھکرا دینا بہت بڑی بات ہے۔ پریم چند کے دل میں عرصے سے سوز ٹپک رہا تھا "سوز وطن" کی کاپیاں جلائی گئیں۔ اُن کے قلم پر تعزیریں بٹھائی گئیں، جس سے انھیں یقین ہو گیا کہ اس نظام حکومت میں ادب آزاد نہیں ہے۔ اسے آزاد کرانے کے لئے تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملازم ہوتے ہوئے بھی انگریزوں کو کبھی پسند نہیں کرتے تھے ایک مرتبہ منشی دیا نارائن نگم نے اپنی لڑکی کی شادی کے موقع پر دعوت میں دیگر احباب کے ساتھ

چند انگریز حکام کو بھی مدعو کیا تھا۔ پریم چند کو یہ بات بری لگی، انھوں نے ایک خط میں صاف لکھا کہ "آپ نے انگریزوں کو ناحق مدعو کیا وہ اُسے دوستی نہیں حکمراں طبقے کی خوشامد سمجھتے ہیں" اور خوشامد انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ملازمت کا انحصار ہی خوشامد پر تھا، اس لئے پریم چند کو ملازمت سے دلی نفرت تھی۔ دیا نرائن نگم کے نام بستی سے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں جو عاجز ہوں وہ ماتحتی سے۔ کام ایسا کرنا چاہتا ہوں جس میں بجز میری طبیعت کے اور کسی کا تقاضا نہ ہو۔ جی میں آوے تو رات دن کام کرتا رہوں اور جی چاہے تو فوراً کروں۔ مگر یہ صرف مالکانہ حیثیت سے ہو سکتا ہے"

مواد پکتا رہا، اور شعور کی پختگی کے ساتھ ذاتی نفرت اجتماعی جدّو جہد کے جذبے میں منتقل ہوتی رہی اور آخر اس نفرت نے استعفیٰ کی صورت اختیار کر لی۔ استعفیٰ کے الفاظ نہ جانے کیا تھے، لیکن ان کی کہانی "لال فیتہ" کے ہیرو ہری بلاس نے بھی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

"جناب من! میرا عقیدہ ہے کہ نظام سلطنت مشیت ایزدی کی ظاہری صورت ہے، اور اس کے قوانین بھی رحم حق اور انصاف پر قائم ہیں۔ میں نے پندرہ سال تک سرکار کی خدمت کی اور حتی الامکان اپنے فرائض کو دیانت داری سے سرانجام دیا۔ ممکن ہے کہ بعض موقعوں پر حکام مجھ سے خوش نہ رہے ہوں، کیونکہ میں نے شخصی احکام کی اطاعت کو

کبھی اپنا فرض نہیں سمجھا۔ جب کبھی میرے احساسِ قانون اور حکمِ حاکم میں
تناقص ہوا میں نے قانون کی پیروی کی۔ میں ہمیشہ سرکاری ملازمت
کو خدمتِ ملک کا بہترین ذریعہ سمجھتا رہا لیکن مراسلہ نمبر .... مورخہ
.... میں جو احکام نافذ کئے ہیں۔ وہ میرے ضمیر اور اصول
کے مخالف ہیں اور میرے خیال میں ان میں ناحق پیروی کا اتنا دخل ہے
کہ میں اپنے تئیں تعمیل کے لئے کسی حالت میں آمادہ نہیں کرسکتا۔ وہ
احکام رعایا کی آزادی میں مخل اور ان کی سیاسی بیداری کے قائل ہیں۔
ان حالات پر نظر کرکے میرا اس نظامِ حکومت سے تعلق رکھنا
ملک اور قوم کی بیخ کنی کرنا ہے۔ دیگر حقوق کے ساتھ رعایا کو سیاسی
جدوجہد کا بھی حق حاصل ہے، اور چونکہ گورنمنٹ اس حق کو پامال کرنے
کی درپے ہے۔ لہٰذا میں ہندوستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت
انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلا مزید تاخیر
اس عہدے سے سبکدوش کیا جائے۔"

یہ کہانی جولائی ۱۹۲۱ء میں "زمانہ" میں شائع ہوئی تھی۔ لہٰذا
یہ تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ پریم چند کے اپنے استعفیٰ کے
الفاظ ہیں۔

پریم چند ہردل عزیز ماسٹر تھے۔ استعفیٰ کے بعد اسکول چھوڑنے
کا منظر "تحریک" کہانی میں یوں پیش کیا ہے:۔

لڑکے مجھ سے مانوس ہوگئے تھے۔ ان کی طرف سے مجھے رنج

دعوت دی گئی اور سب کے سب مجھے اسٹیشن تک پہنچانے آئے۔ اس وقت بھی لڑکوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میں بھی اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا.......... گاڑی آہستہ آہستہ چلی لڑکے کئی قدم اس کے ساتھ دوڑے۔ میں کھڑکی سے باہر سر نکالے کھڑا تھا۔ کچھ دیر تک مجھے ان کے ہلتے ہوئے رومال نظر آئے........"

اس سلسلے میں شورانی دیوی لکھتی ہیں کہ استعفیٰ داخل کرنے سے پہلے پریم چند دو رات تک سوئے نہیں۔ نہ خود بھی نہیں سوئیں سوچتے رہے آخر انھیں بہت بڑا فیصلہ کرنا تھا۔ پرانی زندگی سے رشتہ توڑ کر نئی راہ اختیار کرنی تھی۔ انھیں مخمصے میں پڑے دیکھ کر شورانی دیوی نے کہا ـــــــ "جب ارادہ نیک ہے تو اس پر عمل کرنے میں پس و پیش کیوں، جو سوچا ہے، کر ڈالو۔"

گھر میں

"گھر" کتنی ہی مقدس، ملائم اور خوش
گوار یادوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ گھر محبت
کی آماجگاہ ہے۔ محبت نے بہت ریاضت
کے بعد یہ بردان پایا ہے۔" (پریم چند)

گھر اتنا مانوس لفظ ہے کہ اس کے بارے میں کچھ سوچنے اور اس کی تعریف
یا تشریح ڈھونڈنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن جب سے پریم چند
کی ماں مر گئی تھی تب سے گھر ان کے لئے گھر نہیں رہ گیا تھا۔ اس لئے انھوں
نے گھر کی بابت بہت کچھ سوچا تھا۔ گھر سے وابستہ امنگوں اور حسرتوں
کی انھوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں بارہا ترجمانی کی ہے۔ میدان عمل

میں گھر کی تشریح یوں کرتے ہیں :۔ "جہاں اپنے خیالات کی حکومت ہو وہی اپنا گھر ہے ۔ جو خیالات سے موافق ہوں وہ اپنے سگے ہیں"

بچّے کے بھی خیالات ہوتے ہیں ۔ ماں ان سے ہمدردی رکھتی ہے ۔ اُن میں دلچسپی لیتی ہے اور اُس کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے ۔ یہی اس کی محبت اور ممتا ہے ۔ سوتیلی ماں میں یہ ممتا نہیں تھی اس لئے پریم چند نے کہا کہ:۔ "ماں تو اپنی ہو، سولہ آنے اپنی" کوئی دوسری عورت اس کی جگہ نہیں لے سکتی ۔

سوتیلی ماں کو پریم چند سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ، وہ ان پر اور ان کی بیوی پر حکومت کرتی تھی اور ایک دوسرے کی چغلیاں کر کے انھیں آپس میں لڑاتی بھی رہتی تھی ۔ دوسرا بیاہ ہو جانے کے بعد پہلی بیوی کا ذکر کرتے ہوئے پریم چند نے شورانی دیوی سے کہا تھا کہ اگر "چاچی نہ ہوتی تو شاید ہم دونوں کی آپس میں نبھ جاتی"

چاچی ہی کی بدولت آٹھ سال تک پریم چند کی شورانی دیوی سے بھی نہیں بنی ، اس گھر میں ان کی کوئی قدر نہیں ہوئی ۔ کائستھ برادری کے رواج کے مطابق وہ چاچی سے پردہ کرتی تھیں اور دب کر رہتی تھیں جب چاچی کے رہتے پریم چند ہی اس گھر کو اپنا گھر نہ سمجھتے تھے تو شورانی دیوی کیسے سمجھتیں ؟ انھیں یہ گھر کاٹنے کو آتا تھا ۔ پریم چند تو پھر بھی آدمی تھے کافی عرصہ گھر سے باہر رہتے تھے ، دوستوں سے ہنس کھیل سکتے تھے ، جی بہلا سکتے تھے ۔ پردہ دار عورت کے لئے گھر ہی سب کچھ تھا اور اُسے

یہاں کڑھنا پڑتا تھا، اس لئے وہ سال میں دس مہینے باپ کے گھر اور صرف دو مہینے شوہر کے گھر رہتی تھیں۔ شورانی دیوی کی ماں بھی بچپن ہی میں مر گئی تھی، گھر پر باپ تھا اور ایک چھوٹا بھائی تھا جسے انھوں نے ماں کی طرح پالا تھا، گھر میں انھیں کا راج تھا۔ اس لئے وہاں خوب گذرتی تھی۔

لیکن یہ بات پریم چند کو پسند نہیں تھی۔ دوسرا بیاہ اسی لئے کیا تھا کہ اپنا گھر بنے گا۔ لیکن بیوی لاکر بھی آٹھ سال بے گھر کے گذر گئے میاں بیوی دونوں ہی چاچی کے دست نگر تھے جس کے سلوک میں چنداں فرق نہیں آیا تھا۔ کمانے والے پریم چند تھے لیکن چاچی کے لئے بیٹا اور بھائی ہی اپنے تھے پریم چند غیر تھے۔ اگر اپنے تھے تو صرف اتنے ہی کہ وہ کما کر دیتے تھے۔

یہ بات شورانی دیوی کو بھی پسند نہیں تھی۔ لیکن جب کمانے والا خود کچھ نہیں بولتا، اپنے گھر میں بیگانہ ہو کر رہتا ہو تو وہ بولنے والی کون ہوتی ہیں۔ جب بلاوا آتا تھا چپکے سے باپ کے گھر چلی جاتی تھیں لیکن ایک مرتبہ جب باپ نے انھیں بلایا تو پریم چند نے خلافِ معمول بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اس پر شورانی دیوی بہت جھلائیں اور دونوں میں اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا۔ پریم چند بھی جھلائے اور شورانی کو دو چپت لگا کر باہر چلے گئے، شام کو لوٹے تو منانے لگے۔

"اس طرح کیوں جھلاتی ہو!"

"میں جھلاؤں کیوں؟"

"کیسے کہوں کہ تم جھلائی نہیں ہو؟ نہ کسی سے بولنا نہ کسی سے کچھ کہنا سننا"
"سزا ہی دینے کے لئے تو آپ نے مجھے اپنے گھر جانے نہیں دیا۔ قیدی
کیسے سکھی رہ سکتا ہے"۔
"یہ تمھاری بھول ہے۔ میں نے تمھیں تکلیف دینے کی نیت سے
نہیں بلکہ میں تمھیں جانے دینا نہیں چاہتا۔ سچ کہتا ہوں تم گھر چلی جاتی ہو
تو مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے گھر میں آرام سے
رہو۔ آخر یہ گھر تمھارا کیوں نہ بنے؟"
"مجھے کیا پڑی ہے کہ دوسرے کے گھر میں گھر والی بنوں"۔
"تو گھر کیسے چلے گا، میری سمجھ میں نہیں آتا"۔
"جیسا چل رہا ہے، ٹھیک ہے۔ میں اس بلا کو پالنا نہیں چاہتی۔ پھر
آپ کو تو کافی پیار کرتی ہیں۔ میری بات چھوڑیے۔ میں بھی جس حالت میں
ہوں، اس حالت میں رہ لوں گی۔ میں بھی مست جیو ہوں"۔
"ہاں اسی میں مست رہتی ہو کہ آنند سے جاکر بیٹھتی ہو، جس کو تم
پیار سمجھتی ہو وہ پیار نہیں ہے۔ ماں کی محبت بے غرض ہوتی ہے۔ جب
وہی مجھے نصیب نہ ہوئی تو اس کے پیچھے میں کہاں تک پڑوں"۔
"یہ الفاظ کہتے کہتے اُن کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اس روز سے مجھے
ان پر دیا آنے لگی، اسی دن سے میں ان میں ملنا چاہنے لگی"۔ (پریم چند گھر میں)
اب گھر میاں بیوی کے مشورہ سے چلنے لگا۔ شیورانی دیوی نے خاوند
کی بات مان لی اور چاچی سے پردا اُٹھا کر مالکن بننے لگیں، اور انھوں نے

تھوڑے دنوں میں نہ صرف اپنے لئے بلکہ پریم چند کے لئے بھی اس گھر میں جگہ بنا دی ۔ چاچی کی ہم چخ اور جوڑ توڑ اس کے بعد بھی جاری رہی لیکن شورانی دیوی کے سامنے اُن کی ایک نہ چلتی تھی ۔ بیوی کی اس جرأت کا اعتراف کرتے ہوئے پریم چند نے کہا کہ " اگر پہلے سے تمھارے ساتھ میری شادی ہوئی ہوتی تو میری زندگی اس سے آگے ہوتی ۔"

پریم چند کی زندگی کو آگے بڑھانے میں شورانی دیوی کا واقعی بہت ہاتھ رہا ہے ، جب کبھی بھی اُنھوں نے کوئی فیصلہ کن قدم اُٹھانے کا ارادہ کیا تو شورانی دیوی نے ان کی ہمت بڑھائی ۔ استعفیٰ دینے سے پہلے وہ کئی روز تک سوچتے رہے تھے ۔ اُنھیں دو روز تک نیند نہیں آئی تھی ۔ بچے ہیں ، بیوی ہے ، خود بیمار رہتے ہیں ، گذارہ کیسے چلے گا؟ اس وقت آخری فیصلہ شورانی دیوی نے کیا تھا " تم گذارے کی فکر نہ کرو ۔ وہ چلتا ہی رہتا ہے ۔ اگر دیس قربانی کا تقاضا کرتا ہے تو اُسے دینے میں دریغ نہیں کرنا چاہیے ۔"

ایک دفعہ الور کے راجا نے اپنے پانچ چھ آدمی ایک چٹھی دے کر پریم چند کے پاس بھیجے ۔ راجہ صاحب کہانیوں اور ناولوں کے شوقین تھے انھوں نے پریم چند کو اپنے پاس رہنے کے لئے بلایا تھا اور لکھا تھا کہ چار سو روپے ماہوار تنخواہ بنگلہ اور موٹر ملے گی ۔ انھوں نے راجا کو تو لکھ بھیجا کہ مجھے معاف رکھئے ۔ اتنا ہی غنیمت ہے کہ آپ میری کہانیاں اور ناول پڑھ لیتے ہیں ۔ لیکن گھر جا کر شورانی دیوی سے جھوٹے موٹے مشورہ

کرنے لگے اور بولے :۔ "میری خواہش ہے کہ چلیں، کچھ دن بنگلے موٹر کا شوق تو پورا کرلوں، میری کمائی میں اس کی گنجائش نہیں۔"

شورانی دیوی نے جھٹ جواب دیا :۔ "یہ اسی طرح ہوا جس طرح کوئی بیسوا، اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے چکلے میں بیٹھے۔ پھر جس نے مزدوری کرنا اپنا مقصد بنا لیا ہے، اس کے لئے موٹر بنگلے کی خواہش کیسی!"

پریم چند کی "تحریک" کہانی کا ہیرو کہتا ہے "ماں کے فیض اور اثر سے بڑے بڑے انسان سرفراز ہوئے ہیں۔ میں جو کچھ ہوا بیوی کے فیض اور اثر سے ہوا۔ وہ میری تقدیر کا معمار تھی، کتنی بلند حوصلہ تھی، کتنی آہنی ہمت، کتنا ملکوتی ایثار!"

آدمی کو ماحول اور حالات بناتے ہیں اور اس میں شخصیتوں کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ پریم چند اور شورانی دیوی نے ایک دوسرے کے ارتقا میں بیحد اضافہ کیا۔ شورانی دیوی کی جب شادی ہوئی تو وہ معمولی ہندی ــــ بالکل تھوں کے برابر، جانتی تھیں۔ پریم چند کی صحبت میں پڑھنے لکھنے اور مطالعے کا شوق بڑھا اور وہ خود بھی کہانیاں لکھنے لگیں۔ پریم چند جب کوئی اخبار یا کتاب پڑھتے تو انگریزی سے ترجمہ کرکے انھیں سنایا کرتے تھے اور ان کے ساتھ سماجی اور سیاسی مسائل پر گھنٹوں بحث کیا کرتے تھے، جو لوگ عورتوں کو محض سیر کی سمجھتے ہیں اور ان پر اپنی برتری جتاتے ہیں اور اپنے اس رویے سے گھر کو "تو تو، میں میں" کا

اکھاڑہ بنا لیتے ہیں، پریم چند نے اپنی کہانی "کیچڑ" میں ایسے آدمیوں کی خوب کھلی اڑائی ہے۔

اُن کے تین بچے ہیں، ایک لڑکی اور دو لڑکے۔ لڑکی کا نام کملا ہے وہ مہوبا میں پیدا ہوئی تھی اور اگست ۱۹۱۸ء میں جب وہ بستی سے تبدیل ہوکر گورکھپور گئے تو اس روز ان کا بڑا لڑکا شری پت رائے (دھنو) پیدا ہوا۔ وہیں ایک لڑکا منو نامی پیدا ہوا تھا جو جولائی ۱۹۲۰ء میں مر گیا۔ پریم چند کو اس بچے کے گذر جانے کا بڑا رنج ہوا، لیکن بیوی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ خود انھیں تسلی دیتے رہے۔ اس کے بعد اگست ۱۹۲۲ء میں ان کا چھوٹا لڑکا امرت رائے (بنو) پیدا ہوا۔

وہ اپنے بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے اور دونوں لڑکوں کو دھنو اور بنو کہہ کر پکارتے تھے۔ دفتر سے لوٹ کر گھنٹہ بھر بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے، کہتے تھے کہ اس سے تھکن دور ہوتی ہے۔ روح میں تازگی آجاتی ہے۔ پھر کام پر بیٹھ جاتے تھے۔ جب گاؤں میں تھے تو شام کو دروازے کے باہر بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور خود انھیں طرح طرح کے کھیل سکھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کہانیوں میں بچوں کا ذکر نہایت ہی محبت اور شفقت سے کیا ہے۔ "بھوت" کہانی میں لکھتے ہیں :-

"چوبے جی کے عیش و آرام میں صرف ایک بات کی کمی تھی۔ اُن کے کوئی لڑکی نہ تھی۔ پہلی لڑکی کے بعد پھر لڑکی ہوئی ہی نہیں اور نہ اب ہونے کی اُمید تھی۔ عورت اور مرد دونوں اس کو یاد کرکے رویا کرتے تھے۔ لڑکیاں

بچپن میں لڑکوں سے زیادہ چونچلے کرتی ہیں - ان چونچلوں کے لئے دونو جنے
بے چین رہتے - ماں سوچتی، لڑکی ہوتی تو اس کے لئے گہنے بنوالیتی، اس کے
بال گوندھتی - لڑکی پیر نیاں پہنے ٹھمک ٹھمک آنگن میں چلتی، تو کتنا مزا آتا۔
آخر یہ آرزو اتنی شدید ہوئی کہ منگلا نے اپنی چھوٹی بہن کو بلا کر بیٹی کی
طرح پالنے کا فیصلہ کیا - اس کے ماں باپ غریب تھے راضی ہو گئے - یہ
لڑکی منگلا کی سوتیلی ماں کی بیٹی تھی - بڑی خوب صورت اور بڑی چنچل -
نام تھا بنتی - چوبے جی کا گھر اس کے آنے سے کھل اٹھا - دو چار ہی دن میں لڑکی
اپنے ماں باپ کو بھول گئی - اس کی عمر تو چار برس کی تھی - لیکن اسے کھیلنے
کے بجائے کچھ کام کرنا اچھا لگتا تھا - منگلا رسوئی بنانے جاتی تو بنی بھی
اس کے پیچھے جاتی - اس سے آٹا گوندھنے کے لئے جھگڑا کرتی - ترکاری کاٹنے
میں اسے بڑا مزا آتا تھا - جب تک وکیل صاحب گھر پر رہتے - تب تک
وہ ان کے ساتھ دیوان خانے میں بیٹھی رہتی، کبھی کتابیں الٹتی،
کبھی دوات قلم سے کھیلتی - چوبے جی مسکرا کر کہتے - بیٹی مار کھاؤ گی ؟ بنی
کہتی —— تم مار کھاؤ گے - میں تمہارے کان کاٹ لوں گی - جوجو بلا کر
پکڑا دوں گی - اس پر دیوان خانے میں خوب قہقہے اڑتے ...."

"مستعار گھڑی" کا ہیرو جب اپنے دوست والو سے گھڑی مانگنے
جاتا ہے تو وہ انھیں خوش کرنے کے لئے اُن کے چھوٹے بچے کو جو سامنے صحن
میں کھیل رہا تھا، گود میں اٹھا کر لگا بھینچ بھینچ کر پیار کرنے - والو بولے
"ابھی کھیلنے دو پاجی کو - سؤر ہے، تمہارا کرتا میلا ہوا جاتا ہے میں

تو اُسے چھوتا بھی نہیں۔"

میں نے بزرگانہ انداز سے کہا " میرا کرتا میلا ہو رہا ہے تو اس کی تمھیں کیا فکر ہے، ایسا پھول سا بچہ اور اس کی یہ قدر! تم جیسوں کو ایشور ناحق بچے دیتا ہے۔ تمھیں بھاری معلوم ہوتا ہے تو لاؤ مجھے دے دو۔"

یوں ملامت کرکے میں نے بچے کو کندھے پر بٹھا لیا اور کوئی پندرہ منٹ صحن میں اچکتا پھرا۔ بچہ کھل کھلاتا تھا اور مجھے دم نہ لینے دیتا تھا۔ معلوم نہیں اس سواری کا پہلے بھی کبھی لطف حاصل ہوا تھا یا نہیں۔ مگر تھا وہ بے حد خوش۔"

ان کی محبت بچوں سے کھیلنے کھلانے تک محدود نہیں تھی۔ وہ ماں سے زیادہ بچوں کی خود پرورش کرتے تھے۔ بیوی کے جب دوسرا بچہ ہوا تو وہ پہلے بچے کو اپنے ساتھ لے کر سوتے تھے اور جب شورانی دیوی تیسرے بچے کی ماں بن گئی تو پریم چند دو بچوں کو اپنے ساتھ سلاتے تھے۔ بچے سوتے میں پیشاب کر ہی دیتے تھے وہ رات کو دو مرتبہ اُٹھ کر ان کا بچھونا بدلتے تھے۔ اپنے بھیگے ہوئے کپڑے تبدیل کرتے تھے اور سو جاتے تھے۔

گھر میں بیماریاں لگی ہی رہتی ہیں۔ پریم چند خود پیٹ کے روگ کی وجہ سے اکثر بیمار رہتے تھے۔ لیکن انھیں اپنی بہ نسبت گھر کے دوسرے لوگوں کی فکر زیادہ رہتی تھی، کوئی بچہ بیمار پڑ جاتا تھا تو اُسے ساری ساری رات کندھے سے لگائے گھومتے رہتے تھے۔ اس خیال سے کہ زیادہ محنت

کرنے سے شوورانی دیوی کہیں بیمار نہ پڑ جائیں۔ وہ ہر ایک کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے، اور جب کبھی وہ بیمار پڑ جاتی تھیں تو سارا کام خود کرتے تھے روٹی تک اپنے ہاتھ سے بناتے تھے، برتن مانجھتے تھے۔ جب ماسٹر تھے تو گھر میں اکثر نوکر بھی رہتا تھا لیکن وہ اپنا کوئی بھی ذاتی کام اس سے نہیں کرواتے تھے۔ اسے ڈانٹنے ڈپٹنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیوی سے کہا کرتے تھے کہ نوکر بھی گھر کا ایک فرد ہی ہے۔ ایک مرتبہ ایک نوکر نے انھیں ایسا دھوکا دیا کہ ایک ہزار روپیہ نقد اور ڈیڑھ ہزار روپے کے زیور نکال کر لے گیا۔ انھوں نے تھانے میں رپٹ تک نہیں لکھوائی بیوی سے کہہ دیا "اسے ضرورت تھی، لے گیا۔ لے جانے دو۔ ہمارا کام بھی چلتا ہی رہے گا۔"

چونکہ چاچی کا سبھاؤ تلخ تھا۔ بہن کی چاچی سے بالکل نہیں بنتی تھی اس لیے سوتیلے وہ بیاہی گئی تھی پریم چند نے اسے اپنے گھر نہیں بلایا۔ شوورانی دیوی نے کئی مرتبہ بلانے کے لیے اصرار بھی کیا۔ بلانے کی حسرت ان کے اپنے دل میں بھی تھی لیکن چاچی کے خیال سے چپ رہتے تھے جانتے تھے کہ بہن کے اپنا گھر تو ہے کسی نہ کسی طرح وہاں رہ لے گی اُسے معلوم ہی تو ہے کہ ماں نہیں ہے اور بھائی کا زور نہیں چلتا۔ اگر بلائیں گے تو چاچی کو تکلیف ہوگی۔ اگر وہ تکلیف سے بچ کر جانا چاہے تو کہاں جائے گی؟ اس کا دوسرا کون ہے۔ یہ سوچ کر اپنی طبیعت پر جبر کر لیتے تھے۔

لیکن جب چاچی کا بیٹا برسرِ روزگار ہو گیا اور وہ اس کے ساتھ الگ رہنے لگی تو انھوں نے بہن کو بلا کر اپنے دل کی حسرت پوری کی لیکن اس کے بعد وہ زیادہ دنوں زندہ نہیں رہی، اس کی تین بیٹیاں تھیں۔ پریم چند جو سلوک بہن سے نہ کر سکے تھے وہ اُن سے کرتے رہے۔ انھیں اکثر اپنے گھر بلایا کرتے تھے۔

پریم چند کو گانے کا بھی شوق تھا۔ شورانی دیوی کہتی ہیں کہ جب میں بیاہی آئی تھی تو مجھے گانا نہیں آتا تھا میں نے اُن سے گانا سیکھا، ہولی، دیوالی کوئی تہوار آتا تو بچوں کو ساتھ لے کر خوب ٹھاٹھ سے مناتے تھے ایسے موقعوں پر میاں بیوی دونوں ہی مل کر گایا کرتے تھے، اور سب کو اُن کے دل پسند تحفے خرید کر دیا کرتے تھے۔

چھوٹے، بڑے، بچے، بوڑھے انھیں ہر ایک کا خیال رہتا تھا جو اپنے تھے انھیں ہمیشہ اپنے بنا کر رکھا۔ چاچی کا سبھاؤ ساری عمر نہیں بدلا لیکن وہ جی جان سے اُن کی اور ان کے بیٹے کی پرورش کرتے رہے۔ چاچا جتنے دن جئے انھیں باپ کی طرح مانتے رہے۔ چچیرا بھائی پرانے ڈھنگ کے آدمی تھے شورانی دیوی تک کو ڈانٹ دیتے تھے۔ پریم چند کو یہ پسند نہیں تھا کہ کوئی آدمی عورتوں کو ڈانٹے لیکن بھائی کی عادت کو سمجھتے ہوئے خاموش رہتے تھے۔ یہ حسنِ سلوک اور رواداری اُن کے افسانوں اور ناولوں کی جان ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جو عادتیں پک چکی ہیں انھیں بدلنے کی کوشش کرنا بے کار ہے۔ وہ بزرگوں کے لیے ضرور توہمات اور جہالت کو بھی برداشت

کر لیتے تھے۔

لیکن بچوں کی بے راہ روی انھیں ذرا بھی پسند نہیں تھی۔ اپنے بچوں کی معمولی معمولی حرکتوں کا خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ دھنو اور بنو گھر سے بدا ہو کر الہ آباد جا رہے تھے۔ وہ دونو کالج میں پڑھتے تھے۔ بنو نے تو بڑے ادب کے ساتھ ماں باپ کو پرنام کیا لیکن دھنو ویسے ہی چل پڑا پریم چند کو اس کا یہ رویہ اچھا نہیں لگا۔ مگر شورانی نے کہا کوئی بات نہیں بچہ ہے بڑا ہو کر خود سدھر جائے گا۔ اس سے پریم چند کی تسلی نہیں ہوئی انھوں نے بڑے دکھ سے پیشینگوئی کی۔ "اس لڑکے کے ڈھنگ کچھ اچھے نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ خودغرض اور مغرور بنے گا۔"

اس کے برعکس دوسرا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ ان کی کہاری کا بچہ آگ سے جل گیا تھا۔ اس کے سارے جسم پر مرہم کا لیپ تھا، اور کپڑے بھی گندے تھے۔ چھوٹے لڑکے بنو نے اسے کہیں باہر کھڑے دیکھ لیا۔ وہ اسے اٹھا کر اوپر لایا اور ماں سے کہا کہ اسے کچھ کھانے کو دو۔ پریم چند اس بات سے بہت خوش ہوئے اور بولے "یہ لڑکا بہت رحمدل معلوم ہوتا ہے۔ اس بچے کو تو میں بھی نہ لا سکتا۔ تم دیکھنا، تمھارا نام یہ روشن کرے گا۔"

وہ خود اپنے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ٹیوٹر رکھنا انھیں پسند نہیں تھا، کیونکہ جو کچھ وہ خود پڑھا سکتے تھے، ٹیوٹر کہاں پڑھا سکتا تھا صرف کتابیں پڑھا دینا تو مقصود نہیں تھا۔ وہ انھیں آدمی بنانا چاہتے

چاہتے تھے۔ اس لئے دو تین گھنٹے ہر روز انھیں پڑھانے میں صرف کرتے تھے
پڑھاتے ضرور تھے لیکن بچوں کو ڈانٹنا ڈپٹنا اور نا صحیح بننا انھیں قطعاً
گوارا نہیں تھا "شکوہ و شکایت" کہانی بیوی کی زبانی بیان کی گئی ہے۔
خاوند کا کردار بہت ہی لطیف اور دل کش ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
شورانی دیوی نے خود پریم چند کی کہانی بیان کی ہے۔ اس میں بچوں کے
متعلق خاوند کے رویہ کا ذکر یوں آتا ہے :-

"آپ نے ایک نئی اُپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے
ہیں اس کا نتیجہ ہے کہ لڑکے شتر بے مہار ہو گئے ہیں .... کبھی گلی ڈنڈا
ہے۔ کبھی گولیاں۔ حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھیلتے ہیں"

جب دونوں لڑکے الہ آباد میں پڑھتے تھے تو انھیں یہ فکر رہتی تھی کہ
کہیں دھنو، بنو پر حکومت نہ کرتا ہو۔ شورانی کہتیں، کیا برا ہے؟ وہ
اس کا بڑا بھائی بھی تو ہے۔ لیکن پریم چند جواب دیتے، تم نہیں جانتیں
اس سے بچوں میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے باپ پر کڑھتے
رہتے ہیں، محبت کی حکومت تو کچھ بری نہیں، لیکن کالج میں جاتے ہی
لڑکے خودسر ہو جاتے ہیں۔ میں انھیں آزاد رکھنا چاہتا ہوں"

اس لئے وہ دونوں لڑکوں کو الگ الگ خط لکھتے تھے اور بیوی کو
بھی دونوں کو الگ الگ لکھنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔

شورانی کہتیں :۔ تو کیا اس سے حکومت کا رجحان کچھ رک جائے گا؟
پریم چند :۔ کیوں نہیں رکے گا وہ اسے تکلیف دے گا تو وہ مجھے لکھے

گا۔ میں پوچھوں گا۔

شورانی:۔ بہت سے پتا تو اپنی ذمے داری چھوڑ بیٹھے ہیں۔

پریم چند:۔ وہ نالائق ہیں۔ لائق پتا کب اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈالے گا۔ اگر اس میں ذمے داری اُٹھانے کی طاقت نہ ہو تو کسی کو دنیا میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟

شورانی:۔ دنیا میں آدمیوں کا آنا کب رکتا ہے؟

"تو پھر ایسے نالائقوں کی دنیا میں کمی بھی نہیں۔ سب کچھ انسان کرتا ہے عزت کے لئے۔ جب اپنے ہی گھر میں عزت نہ ہوئی تو کیا؟ مجھے ایسے باپ سے کوئی ہمدردی نہیں جو اپنی ذمے داری دوسروں پر ڈالتے ہیں!"

اس کے علاوہ اور کتنی ذمے داریاں تھیں، اسکول میں نوکری کرتے تھے امتحان دینے کے لئے پڑھتے تھے۔ لکھنے کے لئے مطالعہ وسیع کرتے تھے پھر کہانیاں، ناول اور مضامین لکھتے تھے۔ اپنی اس مصروفیت کا ذکر انھوں نے اپنی "ادیب کا فرض" کہانی میں کیا ہے۔ اور شورانی دیوی بھی نہیں وہی کچھ بتاتی ہیں جو کچھ اس کہانی میں انھوں نے لکھا ہے۔

وہ صبح پانچ کے قریب اُٹھ بیٹھتے تھے، جو کچھ ملتا تھا کھا پی کر لکھنے بیٹھ جاتے تھے۔ قلم ہتھوڑے کی طرح چلتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ادیب نہیں مزدور سمجھتے تھے اور جی توڑ کر محنت کرتے تھے۔ آرام کرنے کی ہوس انھیں نہیں تھی۔ نو بجے تک لکھتے رہتے، پھر اُٹھ کر تیار ہوتے اور کھانا کھا کر اسکول چلے جاتے۔ تین یا چار بجے لوٹ کر آتے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ

بچّوں سے جی بہلاتے۔ پھر روزانہ اخبار "لیڈر" پڑھتے، اور شام کو کھانا کھانے کے بعد رات گئے تک پڑھتے رہتے۔

جس روز کسی وجہ سے لکھنا پڑھنا نہیں ہوتا تھا، پریم چند سمجھتے تھے کہ وہ دن ضائع ہوا۔ اس لئے اکثر بیماری کی حالت میں لکھنا پڑھنا ترک نہیں کرتے تھے۔ "ادیب کا فرض" کہانی میں لکھتے ہیں:۔

"ادیب کا یہ پجاری دنیا و مافیہا سے بے خبر فکر سخن میں غرق رہتا تھا۔ پھر ہندوستان میں سرسوتی کی پوجا لکشمی کی ناراضی کے مترادف ہے۔ دل تو ایک ہی تھا، دونوں دیویوں کو ایک ساتھ کیونکر خوش کرتے۔"

اور مزید لکھتے ہیں:۔

"ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس میں سوز نہیں، لوچ نہیں، دل نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ چراغ وہی لبا لب بھرا ہوگا جو جلا نہیں۔"

"رانی! یہ ہندوستان ہے اس میں
قلم کے سہارے جینا مشکل ہے" (پریم چند)

مستعفی ہونے کے بعد پریم چند کو روزگار کی فکر ہوئی۔ پہلے پوتدار جی کی شرکت میں چرخوں کی ایک دوکان کھلوائی جس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں وہ بنارس چلے گئے اور حالات سے پریشان ہو کر گھوں کا کام شروع کرنا چاہتے تھے۔ اس کے متعلق جب منشی دیانارائن نگم نے یہ مشورہ دیا کہ ہماری یہ لائن نہیں ہے تو پریم چند نے انھیں جواب میں لکھا:۔

"آپ فرماتے ہیں تمھاری یہ لائن نہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں، مگر

چارہ کیا ہے ؟ میں قربانی کو اپنی ذات تک رکھنا چاہتا ہوں، عیال کو اس
چکی میں پیسا نہیں چاہتا۔ فی الحال روٹیاں مل جاتی ہیں، کچھ لٹریری کام کرلیتا
ہوں، یہ قربانی ہے، خدا اور دنیا ئے دوں، قوم اور ذات دونوں کو ساتھ
لئے ہوں۔ میں لٹریری کام کو تھوڑی قربانی نہیں سمجھتا۔ جو شخص اپنی فالتو
آمدنی کا ایک حصہ کسی مدرسے کے لئے خیرات کر دیتا ہے۔ وہ ہماری
قربانی کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا جو اپنے لئے سونا تک حرام کرلیتی ہے
آپ نے میرے لئے کوئی ایسی تجویز نہیں نکالی جس میں فکر معاش سے آزاد
ہوکر میں زندگی کاٹتا۔ میں عرض کرچکا اس سے زیادہ نفس کشی میرے
امکان سے باہر ہے۔ اور آپ نے جب کبھی کوئی تجویز کی وہی ہوائی، آکاشی
معاش سے مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔ ضرورت کے لئے مستقل صورت چاہئے
تکلفات کے لئے آکاشی صورت، تو مضائقہ نہیں .... اخبار کی
زندگی میں کس قدر فکر اور جھنجھٹ ہے .... ابھی ہمارے یہاں وہ
زمانہ نہیں آیا کہ جرنلزم کو CAREER (وجہ معاش) بنایا جاسکے"

پریم چند سے بہتر لکھنے والا کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا پھر بھی انھیں
تصنیفات کی آمدنی نہیں کے برابر ہوتی تھی۔ کہانیاں لوگ مفت چھاپتے تھے
کتابیں پہلے تو چھپتی ہی نہ تھیں، اور اگر چھپ بھی جائیں تو ہزار کتاب کا ایک
اڈیشن کہیں برسوں میں جاکر ختم ہوتا تھا، اردو کا حال تو بہت ہی
پتلا تھا، اور اب تک ہے "بازارِ حسن" ناول انھوں نے اردو میں لکھا
تھا، شائع پہلے ہندی میں ہوا۔ کلکتہ پستک ایجنسی نے اس کے پہلے

ایڈیشن کے لئے یک مشت چار سو روپے دئے، پریم چند کو اپنی ادبی زندگی میں اتنی بڑی رقم پہلی بار ملی تھی یہ ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد اسی پبلسنگ ہاؤس نے انھیں "پریم آشرم" کے لئے تین ہزار روپے معاوضہ پیش کئے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ "سیوا سدن" کی اشاعت سے ہندی میں ان کی شہرت بھی بہت ہوگئی تھی۔ اسے ہندی کا بہترین ناول مانا گیا تھا۔ اسی وجہ سے پریم چند ہندی کی طرف مائل ہوئے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو بستی سے انھوں نے ایڈیٹر زمانہ کے نام ایک کارڈ لکھا:۔

"زمانہ کے لئے ایک قصہ لکھا ہے۔ اب میں ہندی میں بھی لکھ رہا ہوں "سرسوتی"[۱] کو ایک مضمون دیا۔ "پرتاپ"[۲] کے لئے لکھا۔ اس سے زیادہ کام کرنے سے معذور ہوں۔"

۱۹۱۵ء ہی میں بستی سے پھر ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"پریم پچیسی کے ہندی ترجمے کے لئے کئی جگہ سے اصرار ہو رہے ہیں میں خود ہی اس کام کو ہاتھ میں لوں گا۔ اب ہندی لکھنے کی مشق بھی کر رہا ہوں۔ اردو میں اب گذر نہیں۔ معلوم ہوتا ہے بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کردوں گا ...."

بنارس سے ۳۱ مارچ ۱۹۲۶ء کو ایک کارڈ لکھا ہے:۔

"......... زمانہ کے لئے کچھ نہیں لکھ سکا اس کی معافی چاہتا ہوں

۱؎ الہ آباد کا مشہور ہندی رسالہ ۲؎ کانپور کا ہندی اخبار

اردو میں کوئی پرسان حال تو ہے ہی نہیں۔ دو ناولوں کے ترجمے دارالاشاعت پنجاب کو دئے۔ ابھی کچھ طے نہیں ہوا اور منشی ...... صاحب مارے تقاضوں کے ناک میں دم کئے ہیں۔ حالانکہ ۱۵۰ دے چکا ہوں لیکن ابھی اتنا ہی اور دینا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت ہی پر یہ خرچ وصول ہو گا۔"

گویا انھیں اپنی گرہ سے پیسے خرچ کرکے کتابیں چھپوانا پڑتی تھیں "سیوا سدن" کی اشاعت کے چھ سات سال بعد "بازارِ حسن" بھی دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس سلسلے میں پریم چند نے سید امتیاز علی تاج کو جو خط لکھا تھا۔ وہ ذیل میں درج ہے :-

گورکھپور

۲۲ر اپریل ۱۹۲۰ء

مشفق من تسلیم

نوازش نامہ ملا۔ مشکور ہوں۔ "بازارِ حسن" آپ شائع کریں شرائط کے متعلق یہ عرض ہے کہ آپ پہلے ایڈیشن کے لئے مجھے ۲۰ فی صدی رائلٹی عطا فرمائیں۔ پہلا ایڈیشن بارہ سو نکوں کا ہوگا۔ غالباً ایک روپیہ آٹھ آنے قیمت رکھی جائے۔ مجھے ۲۸۰ جلدیں ملیں گی۔ یہ جلدیں خواہ مجھے جلدوں کی صورت میں دیدیں یا روپے کی صورت میں۔ روپے کی صورت میں دینے سے وہی کمیشن جو میں دوسرے بک سیلر مثلاً رسالہ "زمانہ" کو دوں

گا ـــ آپ کو ضائع کروں گا۔ اگر آپ اسے پسند نہ فرمائیں تو مجھے جلد ہی دے دیں۔ میں کسی طرح بیچ یا بکوا لوں گا۔ اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی پسند نہ ہو تو مجھے پہلے ایڈیشن کے لئے ۲۵۰ روپے عطا فرمائیں ہندی میں مجھے پانچ سو ملے تھے، گجراتی ایڈیشن کے مجھے سو روپے ملے۔ آپ جس طرح چاہیں فیصلہ کریں۔ ۲۵۰ روپے غالباً ضرورت سے زیادہ مطالبہ نہیں ہے۔ میری ڈیڑھ سال محنت اور خامہ فرسائی کا نتیجہ یہ کتاب ہے اگر یہ شرطیں سب آپ کو ناگوار معلوم ہوں تو اپنی مرضی کے مطابق کتاب شائع کرکے مجھے جو چاہیں دیدیں۔ میں آپ کا مشکور ہوں گا۔ مجھے یہ سخت ذلت معلوم ہوتی ہے کہ اپنی کتاب کے لئے پبلشروں کی خوشامد کرتا پھروں۔

(۲) "پریم بتیسی" حصہ دوئم کا قصہ "خونِ عظمت" مل گیا ہے۔ پہلا حصہ عنقریب تیار ہے۔ دوسرا حصہ بھی جلد نکلے تو بہتر۔ معلوم نہیں کاغذ دستیاب ہوا یا نہیں۔ میرے پبلشر (ہندی) کلکتہ سے آپ کے لئے ہر ایک قسم کا کاغذ بھیجنے کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ ہیں۔ نصف قیمت پیشگی درکار ہوگی۔ اگر آپ اسے منظور فرمائیں تو کاغذ کا آرڈر وغیرہ اس پتہ سے دے سکتے ہیں۔ میرا حوالہ دینا ضروری ہو گا۔

شری یت مہابیر پرشاد جی
بک سیلرز اینڈ پبلشرز
ہندی پستک ایجنسی۔ ۱۲۶ ہیریسن روڈ کلکتہ

خط سے ظاہر ہے کہ پریم چند کی نظر سے کوئی بھی بات اوجھل نہیں ہوتی تھی۔ ہر ایک معاملے کی خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو، تفصیل میں جاتے تھے،
"پریم بتیسی" کا دوسرا حصہ اسی دار الاشاعت پنجاب سے شائع ہوا تھا۔ "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" کا پہلا حصہ انھوں نے خود شائع کیا تھا۔ اس سلسلے میں پریم بتیسی کا دیباچہ جو انھوں نے خود لکھا تھا قابلِ ذکر ہے لکھتے ہیں:-

"میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ "پریم پچیسی" کئی سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک معاصر اخباروں کا تعلق ہے انھوں نے میری ناچیز کاوش کی داد دی۔ لیکن شائقین پر اس کا بہت کم اثر ہوا۔ پہلا ایڈیشن ختم ہونے میں کم و بیش پانچ سال لگ گئے یہ قدردانی بہت حوصلہ انگیز تو نہ تھی، لیکن مصنف کو تصنیف کے سوا چارہ نہیں۔ اس لئے یہ دوسرا مجموعہ پریم بتیسی کے نام سے پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ پہلے مجموعے کی نسبت اس کا زیادہ چرچا ہو۔ یا سارا طومار دفتر اشاعت کے گودام میں پڑا سڑے۔ میں اپنے فرض سے سبک دوش ہو چکا۔ اب صرف اتنی آرزو ہے کہ ایک مجموعہ پریم چالیسا یا پریم پچاسا کے نام سے اور نکل جائے۔ بس یہی زندگی کا حاصل ہوگا، اور اسی پر قناعت کروں گا۔

اس صوبے میں پبلشروں کا قحط ہے۔ اس لئے یہ مجموعہ دو حصص میں دو جدا جدا مقاموں سے نکالنا پڑا تاکہ زیادہ توقف نہ ہو۔ حالانکہ

اتنی احتیاط کرنے پر بھی کتابت سے اشاعت تک کم وبیش اٹھارہ مہینے ختم ہوگئے ۔"

اسی سلسلے میں ایڈیٹر زمانہ کو گورکھپور سے ایک خط میں لکھا تھا ۔

"کیا حوصلہ اخبار نویسی اور لٹریری کام کا ہو۔ پریم پچیسی حصہ اول کو چھپے ہوئے چار سال ہوئے ۔ مگر ابھی تک نصف پڑی ہوئی ہے ۔ حصہ دوم کی مشکل سے ۱۵۰ جلدیں نکلی ہیں ۔ میں اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا اور بہتر کامیابی کی امید نہیں رکھتا ۔ آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میرے ہندی ناول نے خوب شہرت حاصل کی اور اکثر نقادوں نے اسے ہندی زبان کا بہترین ناول کہا ہے ۔ یہ بازارِ حسن" کا ترجمہ ہے ۔ "بازارِ حسن" اب صاف کر رہا ہوں ۔"

انھیں کے نام ۲۳ر اپریل ۱۹۲۷ء کا خط ہے :-

"میرا ارادہ ایک لیتھو پریس رکھنے کا ہے .... لوگ کہتے ہیں بنارس میں لیتھو پریس نہیں چل سکتا ۔ لیکن ایک بار کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں ۔ میری کئی کتابیں نکلنے کے لئے تیار ہو رہی ہیں ، پریم پچیسی ختم ہوگئی ، گوشۂ عافیت محض اس لئے ناتمام ہے کہ کوئی پبلشر نہیں ہے ۔ تازہ ڈرامہ سنگرام بھی اردو میں نکالنا چاہتا ہوں ، جب تک یہ کتابیں تیار ہوں گی ۔ غالباً میرا نیا ناول تیار ہو جائے گا ۔"

یہ دقتیں تھیں جن سے ہمارے دیس کے ادیبوں کو اب بھی دوچار ہونا پڑتا ہے ، اول تو پبلشر ملتا نہیں ، اور اگر ملتا ہے تو کوشش

یہ ہوتی ہے کہ کتاب مفت مل جائے ۔ اگر کوئی دھن کا پکا ادیب بارہ پندرہ
فیصدی رائلٹی طے بھی کر لیتا ہے تو وہ بھی اسے نہیں دی جاتی ۔ پبلشر
منافع میں اپنے شریک کار بک سیلروں کو تیس چالیس فیصدی کمیشن
دیتا ہے اور باقی خود ڈکارتا ہے ظلم ہوتا ہے بے چارے مصنف پر ۔ یہی
حالت پریم چند کے ساتھ ہوئی تھی ، ان کی اکثر کتابیں لاہور سے شائع
ہوئی ہیں ۔ دارالاشاعت کے علاوہ وہاں ان کے دوسرے پبلشرز
لاجپت رائے اینڈ سنز تھے ۔ "غبن" "پردہ مجاز" اور کہانیوں کا مجموعہ
"خواب و خیال" انھی کے یہاں سے شائع ہوئے ہیں ۔ پریم چند کو دونو
سے شکایت تھی ۔ ایڈیٹر زمانہ کو اس سلسلے میں ۲۵ر فروری ۱۹۳۲ء
کے ایک خط میں لکھا ہے :۔

"پردۂ مجاز ابھی تک پبلشر نے نہیں بھیجا ، کئی خطوط لکھ چکا ، نہ
روپے بھیجتا ہے نہ کتابیں ، نہ جواب دیتا ہے ۔ معلوم نہیں بیمار رہے
یا کیا ؟ ادھر "غبن" کا ترجمہ بھی شروع کر دیا ہے ۔ ایک نیا ناول بھی
شروع کر دیا ہے ۔ مگر سرد بازاری بلا کی جان ہو رہی ہے ......
کتابوں کی کافی بکری نہیں ...."

اوپندر ناتھ اشک کو ایک خط میں لکھا تھا ....

بک سیلروں کا تجربہ آپ سے زیادہ مجھے تلخ ہوا ہے ۔ ایک پبلشر
.... میرے ڈیڑھ سو روپے دبائے بیٹھا ہے ۔ لاہور ہی میں ایک
دوسرا پبلشر میرے سات سو روپے ہضم کرنا چاہتا ہے ۔ اخبارات کا یہ

حال ہے بک سیلروں کا یہ ، بے چارہ مصنف کیا کرے ...."

کتابیں بکنے اور چھپنے کے بارے میں پریم چند کو یہ شکایت آخری عمر تک رہی ۔ صرف اردو ہی پر موقوف نہیں، ہندی میں بھی یہی کیفیت تھی او پندر ناتھ اشک نے بنارس کینٹ سے ۹ جولائی ۱۹۳۶ء کو لکھا ہوا اُن کا حسبِ ذیل خط شائع کیا ہے :-

ڈیر او پندر ناتھ

دعا۔ تم تعجب کر رہے ہو گے کہ میں نے تمہارے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ میں پندرہ دن سے قیدی بستر ہو رہا ہوں ، ہاضمہ کی شکایت ہے ، جگر اور معدہ کی خرابی ۔ کوئی کام نہیں کرتا تمہاری پریشانیوں کا قصہ پڑھ کر رنج ہوا۔ اس مہاجنی دور میں پیسے کا نہ ہونا عذاب ہے ۔ زندگی خراب ہو جاتی ہے ۔ لیکن یہ بھی نہ بھولنا کہ غریبی اور مصیبتوں کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہوتا ہے ۔ انھی آزمائشوں میں انسان انسان بنتا ہے۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ۔

ہندی میں بھی وہی کیفیت ہے جو اردو میں ۔ کتابیں نہیں بکتیں ۔ پبلشر کوئی نئی کتاب چھاپتے نہیں ...."

۱۹۳۲ء میں پنڈت بنارسی داس چترویدی نے پریم چند سے تین سوالات دریافت کئے تھے ، ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپ کو اپنی تصنیفات سے کتنی آمدنی ہوئی ؟"

پریم چند اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

"آمدنی کی کچھ نہ پوچھئے۔ تمام ابتدائی کتابوں کا حق طباعت پبلشرز کو دے دیا۔ "سیوا سدن" "پریم آشرم" "سپت سروج" "سنگرام" کے لئے ہندی پستک ایجنسی نے ایک مشت تین ہزار روپے دئے تھے اور نونِدھی کے لئے شاید اب تک دو سو روپے ملے ہیں۔ دولارے لال جی نے "رنگ بھومی" کے لئے اٹھارہ سو روپے دئے تھے اور دوسرے مجموعے کے لئے سو دو سو روپے مل گئے ہوں گے "کایا کلپ" "آزاد کتھا" "پریم تیرتھ" "پریم پرتیما" "پرتگیا" میں نے خود چھاپیں۔ مگر مشکل سے ابھی تک چھ سو روپے وصول ہوئے ہیں۔ تصانیف سے متفرق آمدنی پچیس روپے ماہوار ہو جاتی ہے مگر کبھی کبھی اتنی بھی نہیں اور ترجموں میں شاید دو ہزار سے زائد نہیں ملا۔ آٹھ روپے میں رنگ بھومی اور پریم آشرم دونوں کے ترجموں کا معاملہ ہو گیا۔ "ہنس" اور "جاگرن" کی اشاعت میں تقریباً دو سو روپے ماہوار کا نقصان ہو رہا ہے۔"

پبلشروں سے انھیں یوں دوچار ہونا پڑتا تھا، سود خور اور منافع خور مہاجنی دور سے انھیں جو نفرت تھی اس میں ان پبلشروں کا اور کساد بازاری کا بھی بہت حصہ تھا۔ دیگر حالات کی طرح اس کیفیت کا عکس بھی اُن کی تحریروں میں خوب ملتا تھا۔ غریب مصنف اور سرمایہ دار پبلشر میں جو فطری تضاد ہے "ڈیمانسٹریشن" کہانی میں اس کی بہت صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس میں جو مبالغہ کی رنگ آمیزی اور مصنفانہ اضافہ ہے وہ ان کی تخلیقی قوت کی دلیل ہے ورنہ یہ کہانی

ذاتی تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے، لکھتے ہیں :-

"گورو پرساد کو ڈرامہ لکھ کر وہی خوشی حاصل ہوئی ہے جو ایک مصنف کو اپنی تصنیف مکمل کرنے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہے، جس خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ اس نے یہ تصنیف مکمل کی ہے اسی خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ پبلشر اور پڑھنے والے اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ناٹک لکھنے کے بعد ناٹک کمپنی کے مالک سیٹھ سے سودا پٹانے کی بات آتی ہے اس کے لئے گورو پرساد کے دوست خوب ٹھاٹھ سے موٹروں پر جانے کی تجویز کرتے ہیں تو سادہ لوح گورو پرساد کہتا ہے کہ سادے ڈھنگ سے تانگوں میں جانے سے کیا برائی ہے۔ اس پر اسے جواب ملتا ہے۔

"دلوچہ بہاری نے کہا :- آپ تو گھاس کھا گئے ہیں۔ ناٹک لکھ لینا ایک بات ہے اور معاملے کو پٹانا دوسری بات ہے۔ روپیہ صفحہ سنا دے گا۔ اپنا سا منہ لے کر رہ جاؤ گے۔"

پریم چند کو کئی مرتبہ شائد روپیہ صفحہ بھی نہیں ملا تھا، کیونکہ اپنے آخری ناول "گئودان" کے لئے جبکہ وہ اتنی شہرت حاصل کر چکے تھے روپیہ صفحہ سے زیادہ ملنے کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ انھیں اکثر اوقات بہت معمولی رقم کے لئے اپنی کتابوں کے جملہ حقوق بیچ دینے پڑتے تھے۔ اردو کی لگ بھگ سب کتابوں کے حقوق پبلشروں کے پاس ہیں۔ ہندی کی البتہ وہ کتابیں بچ رہی تھیں جو انھوں نے

خود شائع کی تھیں۔ پھر سیٹھ ہوتا ہے، سیٹھ کا دلال ہوتا ہے۔ غریب مصنف کو کیسے ہیتے چڑھایا جاتا ہے وہ سب اس کہانی میں موجود ہے۔

گورو پرساد اور اس کے دوست جب ڈرامہ سناتے ہیں تو سیٹھ جی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ پتھر کی مورتی بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ اپنے چہرے سے دلی جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیتے۔ آخر میں صرف دوسرے دن آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور جب گورو پرساد اور اس کے دوست دوسرے دن حاضر ہوتے ہیں تو ان کی خوب خدمت کی جاتی ہے۔ دعوت مزیدار ہے۔ آج سیٹھ جی خاموش نہیں، ڈرامے کی خوب تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ کی اس محنت اور لگن کا معاوضہ کون دے سکتا ہے؟ قریب سے دلال بول اٹھتا ہے "ممکن ہی نہیں، ایسی تخلیقات کے معاوضے کا تصور کرنا ہی ان کی توہین کرنا ہے۔ ان کا معاوضہ اگر کچھ ہے تو وہ اپنی روح کا اطمینان ہے۔ اور وہ اطمینان آپ کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہے۔"

سیٹھ۔ آپ نے بالکل سچ کہا کہ ایسی تخلیقات کا معاوضہ اپنی روح کا اطمینان ہے............ آپ یہ ڈرامہ لے لیجئے اور آج ہی پارٹ بھی تقسیم کر دیجئے، تین ماہ کے اندر اسے کھیل ڈالنا ہوگا............"

چنانچہ ڈرامہ لے لیا گیا۔ اور جب گورو پرساد دل برداشتہ اٹھ کر چلنے لگے تو سیٹھ جی پھر بولے۔ حضور کو تھوڑی سی تکلیف

ادر کرنی ہوگی، ڈرامہ کا رہرسل شروع ہو جائے گا تو آپ کو تھوڑے دن کمپنی کے ساتھ رہنے کی تکلیف اُٹھانی پڑے گی۔

چلئے تو دوست سیٹھ کے رویہ پر تنقید کر رہے تھے لیکن گوریساد اس تنقید میں شریک نہ ہوئے، وہ اس طرح سر جھکائے چلے جا رہے تھے گویا اس حالت کو ابھی تک سمجھ نہ سکے ہوں۔"

آخر زندگی میں پریم چند کو کہانیوں اور مضامین کا معاوضہ ضرور ملنے لگا جو بالکل ناکافی تھا۔ تاہم اس سے ان کی بعض ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں۔ اور کئی مرتبہ وہ ضرورت کے لئے لکھتے بھی تھے، اپنے افسانہ "فلسفی کی محبت" میں لکھتے ہیں:۔

"لالہ گوپی ناتھ کو اب ضرورتاً تصنیف کا شوق ہو گیا تھا۔"

"ادیب کا فرض" کہانی میں جب ادیب کی بیوی تنگ دستی کی شکایت کرتی ہے تو ادیب جواب دیتا ہے ـــ "دو ایک رسالوں سے میرے مضامین کے روپے آنے ہیں شاید کل تک آجائیں۔"

ایک دفعہ ایک بنگالی کو انھوں نے دو تین سو روپیہ دیا تھا، اور کچھ عرصہ گھر پر بھی رکھا تھا، وہ صاحب اپنے آپ کو ادیب کہتے تھے اور پریم چند پر خوب رنگ چڑھایا تھا۔ اس نے جب شادی کی تو شیورانی دیوی سے چوری چوری، پریم چند نے اس کی بیوی کے لئے زیور اور کپڑے اُدھار بنوا دئے، اور پھر چوری چوری کہانیاں اور مضامین

لکھ کر یہ رسم ادا کی ۔ بنگالی بہت ہی غلط آدمی تھا، اس کا ذکر انھوں نے اپنی ایک کہانی میں کیا ہے۔ ہندی میں اس کہانی کا نام " ڈھپور سنکھ " ہے یعنی وہ آدمی جو باتیں بہت بنائے لیکن عمل میں کورا ہو۔

پریس

"ادبی خدمت پوری عبادت ہے"

(پریم چند)

جب چراغ کا کام جلنا ہے، وہ جلتا رہے گا اور اجالا پھیلاتا رہے گا، لیکن آدمی جب چراغ بننے کا فرض شعوری طور پر انجام دیتا ہے تو وہ صرف جلنے ہی پر اکتفا نہیں کرتا۔ اسے یہ فکر ہوتی ہے کہ جس اجالے کو وہ جنم دیتا ہے اُسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائے۔ پریم چند اسی دھن کے ساتھ ادب کی تخلیق کرتے تھے، اور وہ چاہتے تھے کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائے۔ اس لئے انھوں نے کچھ کتابیں خود چھپوائیں اور کچھ منافع خور پبلشروں کو اونے پونے داموں دے دیں

پھر بھی نشر و اشاعت کی ان کی آرزو پوری نہیں ہوئی، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اپنا پبلشنگ ہاؤس ہو، پریس ہو، جہاں ان کی اور دوسرے لکھنے والوں کی کتابیں آسانی سے چھپ سکیں۔ جلد سے جلد لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچائی جا سکیں۔

ملازمت کے دنوں میں ہی یہ جذبہ ان کے دل میں زور پکڑ گیا تھا اور مسلسل تحریک بنتا جا رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی مرضی سے کام لیں تاکہ ان کی تمام تخلیقی قوتیں بروئے کار آ سکیں۔ ایڈیٹر زمانہ کو بستی سے ایک خط میں لکھا تھا۔

"میں عاجز ہوں تو ماتحتی سے۔ کام ایسا کرنا چاہتا ہوں جس میں بجز میری طبیعت کے اور کسی کا تقاضا نہ ہو۔ جی میں آوے تو رات دن کام کرتا رہوں۔ اور جی چاہے تو کچھ نہ کروں۔ مگر یہ صرف مالکانہ حیثیت سے ہو سکتا ہے۔"

ایک رات پریم چند جب بستی سے کانپور گئے تو وہاں گنیش شنکر ودیارتھی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے نیا پریس لگایا تھا اور اپنا اخبار جاری کیا تھا۔ پریم چند ودیارتھی کے اپنے دفتر میں کام کاج کے ڈھنگ سے بہت متاثر ہوئے۔ گھر لوٹ کر شورانی دیوی سے اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گنیش شنکر ودیارتھی بڑے محنتی آدمی ہیں۔ پریس اور اخبار کا سارا کام خود دیکھتے ہیں۔ مجھے ان کی کامیابی میں ذرا بھی شک نہیں، کیونکہ ایسا آدمی ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں بھی اسی لگن سے کام کروں۔

لیکن ملازمت ترک کر دینے کے بعد بھی انھیں پریس کھولنے اور مالک کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع نہیں ملا ۔ اس کے لئے پیسہ درکار تھا ۔ چرخے کی دوکان کھولی تھی جو چل نہیں سکی ۔ اس کے بعد کانپور کے مارواڑی اسکول میں ملازم ہو گئے ۔ اس اسکول کے منیجر ایک صاحب کاشی ناتھ تھے وہ کانگریسی اور دیش بھگت تھے ۔ پریم چند انھیں بڑے بھلے مانس اور شریف سمجھتے تھے لیکن تجربے سے تن کے اُجلے اور من کے میلے ثابت ہوئے ۔ وہ ٹیچروں کے ساتھ نہایت سختی اور بدمزاجی سے پیش آتے تھے ۔ اسکول کے ٹیچر کیا تھے پورے ڈکٹیٹر تھے ۔ پریم چند ان کا یہ رویہ کب برداشت کر سکتے تھے ۔ جلد ہی ان بن ہو گئی اور وہ مارچ ۱۹۲۳ء میں یہاں سے مستعفی ہو کر پھر بنارس چلے گئے اور اپنے جدی گاؤں ہی میں جا کر رہنے لگے ۔ وہاں انھوں نے پرانے مکان کی جگہ تین چار ہزار روپیہ صرف کر کے پکا مکان بنوایا اور خیال تھا کہ یہیں عمر بھر بیٹھ کر لٹریری کام کریں گے ۔ مستعفی ہونے اور گاؤں جانے تک کے یہ حالات اُن کی "تحریک" کہانی میں بہت اچھی طرح درج ہیں ۔

کاشی ناتھ کے مارواڑی اسکول کی جگہ اس کہانی میں کالج کا ذکر ہے ۔ لیکن بات وہی ہے لکھتے ہیں :- "مجھ پر جا و بے جا حملے کئے جانے لگے ۔ میں خلوص کے ساتھ اصلاح و فلاح کی تجویز پیش کرتا ، اس کی مخالفت کی جاتی .... بے معنی اور لچر اعتراضات نے میرا ناک میں دم کر دیا .... میں نے استعفیٰ دے دیا ۔ دنیا کا ایسا تلخ تجربہ اب تک مجھے نہ ہوا تھا ۔"

اور اس کے بعد گاؤں میں رہنے کی بات اس کہانی میں یوں لکھی ہے:
"میں نے دنیا سے منہ موڑ لیا اور گوشۂ گمنامی میں زندگی کے دن پورے کرنے کا ارادہ کرکے ایک چھوٹے سے گاؤں میں مقیم ہوگیا۔ چاروں طرف اونچے اونچے ٹیلے تھے ایک طرف گنگا بہتی تھی۔ میں نے دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا اور اس میں رہنے لگا۔"

مگر گاؤں میں وہ بہت دن نہیں رہے۔ شیو پرشاد گپت بنارس سے ہندی کا ایک ماہوار رسالہ "مریادا" نکالتے تھے جس کے ایڈیٹر بابو سمپورن آنند تھے۔ وہ نان کوآپریشن کے سلسلے میں گرفتار ہوکر جیل چلے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں پریم چند کو "مریادا" کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ ڈیڑھ سال بعد بابو سمپورن آنند جب جیل سے چھوٹ کر آئے تو یہ کام پھر ان کے سپرد کر دیا گیا۔

"مریادا" میں پریم چند کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملتے تھے اس کے بعد سوا سو روپے ماہوار پر کاشی ودیا پیٹھ میں ٹیچر مقرر ہوگئے۔ یہ کام بھی ان کی طبیعت کے موافق نہیں تھا۔ صرف ایک سال بعد ودیا پیٹھ کی ملازمت سے الگ ہوگئے۔

اب انھوں نے نشر و اشاعت کا کام شروع کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری اور اپنے دو عزیزوں کی شرکت میں انھوں نے بنارس میں سرسوتی پریس قائم کیا۔ اس میں انھوں نے خود ساڑھے چار ہزار روپیہ لگایا۔ لیکن جب منافع کی جگہ الٹا کچھ نقصان ہی

ہوا تو رفتہ رفتہ پریس کی ساری ذمہ داری صرف انھیں پر آ پڑی۔ دوسرے حصے دار ایک ایک کرکے الگ ہوتے گئے۔

کسی کام کو ادھورا چھوڑنا شکست قبول کرنا۔ پریم چند کی عادت نہیں تھی۔ وہ پوری مستعدی سے ایک کام کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور محنت اور لگن سے ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کی کوشش کرتے تھے۔ پریس کے کام میں وہ پوری تندہی سے لگ گئے۔ دن سارا پریس میں صرف ہو جاتا تھا یا پھر ملاقاتی آ جاتے تھے۔ اس لئے پڑھنے لکھنے کا کام اکثر رات کو کرتے تھے شورانی دیوی کو ان کی یہ مصروفیت پسند نہیں تھی۔ صحت خراب تھی اس لئے کڑی محنت سے منع کرتی رہتی تھیں۔ کم از کم ان کا راتوں کو جاگنا قطعی پسند نہ تھا۔

ایک روز شورانی نے اعتراض کیا تو پریم چند ہنس کر بولے :۔ "بھائی تب کیا کیا کروں؟ صبح گھومنا بھی ضروری ہوتا ہے، گھوم کر آتے ہی ناشتہ کرکے کام کرنے اپنے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں، خود بھی لکھتا پڑھتا ہوں ساتھ ہی تمھارے بچوں کو بھی پڑھاتا ہوں۔ اس کے بعد پھر اٹھتا ہوں، نہاتا دھوتا ہوں، کھانا کھاتا ہوں، اس کے بعد پریس جاتا ہوں۔ پریس سے آکر ایک گھنٹے تک بچوں سے بات کرتا ہوں، نہیں، وہ بھی سب بتے ہو جائیں، پھر اسی کے ساتھ ساتھ اپنی بھی تھکان مٹ جاتی ہے۔ اس کے بعد پریس کا منشی آجاتا ہے اسے کچھ نہ کچھ بولنا ہی پڑتا ہے۔ پھر نو بجے اٹھ کر کھانا کھاتا ہوں۔ ایک گھنٹہ ہی باقی بچتا ہے۔ اتنی ہی دیر میں چاہے جو کچھ پڑھوں لکھوں اس پر سرکاری

حکم ہے کہ دس بجے سو جاؤ۔ سرکاری حکم ٹالا بھی جا سکتا ہے پر تمھارا تو ٹالا بھی نہیں جا سکتا۔ اب تمھیں بتاؤ اس میں کتنا سمے میں نکال سکتا ہوں " لیڈر" تو میں پریس میں پڑھتا ہوں۔ میرا تو ایک ایک سیکنڈ بٹا ہوا ہے۔ میں تو ایشور سے مناتا رہتا ہوں کہ رات چھوٹی ہوا کرے، دن بڑا "

(پریم چند گھر میں)

پریس میں انھوں نے ایک طرح اپنی روح ڈال دی تھی۔ بیماری تک کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ شورانی دیوی گاؤں میں تھیں انھیں پیچش ہو گئی تھی جو پیسے بیوی دوا کے لئے دیتی تھیں وہ آپ پریس میں صرف کر دیتے تھے۔ دو مہینے بیماری ہی کی حالت میں گذر گئے۔ تب شورانی دیوی نے انھیں گاؤں چلنے کو کہا۔

آپ بولے:۔ پریس کا کام کون کرے گا؟

شورانی:۔ جب طبیعت اچھی نہیں ہو رہی ہے تو کیا کیجئے گا؟

آپ:۔ کام بھی تو مجھے بہت کرنا ہے۔

شورانی:۔ کام بھاڑ میں جائے۔ ایک نہ ایک تو لگا ہی رہے گا۔

آپ:۔ کیا بھاڑ میں کام چلا جائے گا؟ اسے تو پورا کرنے ہی سے چھٹی ہو۔

فروری ۱۹۳۳ء کو پریس میں ہڑتال ہو گئی تھی۔ شورانی دیوی نے اس کا ذکر اس طرح کیا۔

" میرے پریس میں ہڑتال ہو گئی تھی۔ آپ وہاں سے آئے اداس سے بیٹھے رہے۔ میں انھیں اداس دیکھ کر پوچھ بیٹھی کہ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟

آپ بولے :۔ طبیعت تو بہت اچھی ہے ۔

میں بولی :۔ تو اُداس کیوں ہیں ؟

آپ بولے :۔ اس پریس کے کارن مجھے بڑی پریشانی رہتی ہے ۔

میں بولی :۔ کیا ہے ؟ بتاؤ تو ۔

"کیا بتاؤں منیجر اور مزدوروں میں پٹتی ہی نہیں "

" وہ کام نہ کرتے ہوں گے ، منیجر بے چارا کیا کرے ؟"

" بھائی منیجر بھی تو اپنے کو خدا سے کم نہیں سمجھتا "

" خدا کیوں سمجھے گا اپنے کو ؟ اگر ٹھیک ٹھیک کام نہ کرائے تو آپ بھی تو اس پر بگڑ پڑیں گے "

"ذراسی بات پر تو لوگوں کو غیر حاضر کر دیتا ہے ، پیسے کاٹتا ہے "

" تو پھر اس کا کیا دوش ؟"

" نہیں منیجر کی سب شرارت ہے کبھی گھڑی کو سست کر دیتا ہے کبھی تیز کر دیتا ہے ۔ میں نے اکاؤنٹ میں بھی بیسیوں بار سمجھا دیا ہے بابا ایسا مت کرو پر مانے تب نہ ۔ پھر پریس میں تو طرح طرح کے گھاٹے ہیں ۔ کیا اتنی مزدوروں کے بل پر گھاٹے پورے ہوں گے ۔ ہم لوگوں کو تو زیادہ روپے ملتے ہیں ۔ پر خرچ بھر کا پورا نہیں پڑتا ۔ تب غریبوں کو کیسے پورا پڑے گا! پیسوں کی مصیبت تو ان لوگوں کے سر پر ہے ۔ ان لوگوں کی تنخواہ تب نہیں کٹتی ، جب یہ ہفتوں غائب رہتے ہیں ، تب کیوں مزدوروں کی ہی تنخواہ چار منٹ دیر سے آئیں تو کٹ جائے ؟ ذرا بھی دیر ہوئی کہ جھٹ نکال کر

دوسرے کو ملالیا، ہمارے یہاں پڑھا لکھا سماج سب سے زیادہ خود غرض ہو گیا ہے۔"

"ایک کے پیچھے آپ سارے سماج کو بدنام کر رہے ہیں۔"

"میرا کہنا تم سچ مانو۔"

"تو پھر آپ اپنے کو دوش دیجئے۔ منیجر کو کیوں دوشی ٹھہراتے ہیں؟"

آپ بولے:۔ میں تو کبھی نہیں اپنے چھوٹوں سے لڑتا۔ ہر جگہ یہی اتیاچار (ظلم) ہے، اگر یہ اپنے سے چھوٹوں کو برابر کا سمجھیں تو جھگڑا ہڑتال کبھی نہ ہو۔ حرکتوں سے تو ان کی ہڑتال ہوا پر بدنامی اور ہار میری ہو۔ اب جب تک ہڑتال ختم نہیں ہو گی۔ تب تک سارا کام رکا پڑا ہے۔ طبیعت ادھر لگی رہتی ہے، کام کیا ہو گا خاک؟"

میں بولی:۔ "آپ کی طرح منیجر بھی بیٹھا رہے گا۔ یہ مزدور بھی کسی سے کم تھوڑے ہی ہیں۔"

آپ بولے:۔ نہیں جی، وہ مزدوروں سے بڑھ کر ہیں۔ دیکھتا ہوں برابر نقصان ہو رہا ہے پر بولتا نہیں ہوں، کام لینے کے ڈھنگ بھی ہوتے ہیں۔" (پریم چند گھر میں)

یہ ان کا طریقہ تھا، یہ مشکلات تھیں، لیکن نقصان اٹھاتے ہوئے بھی پریس کو چلا رہے تھے۔ بیچ میں نوکری بھی کرنی پڑی لیکن ایک دفعہ شروع کرکے پریس بند نہیں کیا "کایا کلپ"، "غبن" اور "کرم بھومی" اور "گئو دان" آپ نے اسی پریس میں شائع کئے۔ اس کے علاوہ "مان سرور" اور "پریم دوادشی" وغیرہ کہانیوں کے مجموعے بھی اسی پریس میں چھپے۔

اب اتنا ہو گیا کہ جو کچھ وہ لکھتے تھے کم از کم ہندی میں جلدی چھپ جاتا تھا۔ لیکن کساد بازاری کے باعث کتابیں بکتی نہیں تھیں سٹاک پڑا رہتا تھا اور بک سیلر بھی رقم جلدی نہیں لوٹاتے تھے۔ کتابوں کا ریویو وغیرہ کرانے میں کافی جھنجھٹ رہتا تھا۔ مگر پریم چند کسی کام کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے، ہر ایک بات کا دھیان رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک خط قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے "گئو دان" کی ایک جلد "مادھوری" میں برائے ریویو بھیجی، ایڈیٹر بانکے بہاری لال نے دو جلدیں طلب کیں۔ آپ نے اس کے جواب میں جو خط لکھا وہ حسب ذیل ہے :-

پریہ بانکے بہاری لال جی

آپ "گئو دان" کی آلوچنا کر رہے ہیں۔ یہ جان کر بڑا آنند پایا۔ساتھ ہی آج کل جو درگتی ہو رہی ہے اس کی کچھ نہ کچھ ذمے داری پتر کاروں پر بھی آتی ہے، جن میں ایک میں بھی ہوں۔ چاہیئے تو یہ کوئی اچھی چیز نکلے تو اس کا سواگت کیا جائے۔ لیکھک کو پرا دتساہت[1] کیا جائے، اور پرتین[2] کیا جائے کہ پستک کی کھپت ہو اور لیکھکوں تتھا پرکاشکوں کا دل بڑھے، مگر پرکاشک تو یہاں ہے ہی نہیں۔ آپ آج کوئی پستک لکھ کر پرکاشک کھوجنے نکلیں تو آپ کو سمجھتے بھارت درش میں ایک بھی نہ ملے گا جو آپ کی محنت کا کچھ معاوضہ دے یا رائلٹی پر ہی چھاپے۔ رائلٹی پر چھاپ بھی دے گا

---

[1] حوصلہ افزائی [2] کوشش [3] تمام

تو کبھی ملے گی نہیں ۔ آپ جب مانگیں گے تو جواب ملے گا کہ "پستک کی بکری
نہیں ہوتی" اس لئے میرے جیسے دو چار لیکھکوں نے خود اپنی پستک چھاپنی
شروع کیں ۔ کیونکہ ہمارا جیون ڈیو سائے[1] یہی ہے ۔ اگر کوئی پرکاشک
ڈھنگ کا ملتا تو ہمیں پستکوں کا روزگار کیوں کرنا پڑتا ؟ لیکن پرستھتیوں[2]
میں پڑ کر یہ جھنجھٹ بھی اٹھانا پڑا ۔ اب اگر سبھی سمپادک[3] یا منیجر دو دو پرتیاں[4]
مانگیں تو اس غریب کا تو پوسٹیج میں ہی دیوالہ پٹ گیا ۔ گئودان کی ایک
پرتی پر محصول بارہ آنے ہے ۔ دو پرتیوں کا محصول ڈیڑھ روپیہ ہوگا ۔ اگر
۵۰ کاپیاں بھی بھیجنا پڑیں تو ۳۷ روپے محصول ہو جائے گا ۔ بہت سے سجن
تو آلوچنا کرتے ہی نہیں ۔ یہی دیکھ کر کچھ پرکاشک پتروں کے پاس اپنی پستک نہیں
بھیجتے ...."

اس جذبے سے پریم چند نے پریس جاری کیا تھا ۔ جیتے جی انھیں اس سے
ذرا بھی منافع نہیں ہوا ہے ۔ وہ جو کام کرنا چاہتے تھے، منافع کی نیت سے
ہو ہی نہیں سکتا تھا ۔ ساتھ انھوں نے ماہوار رسالہ "ہنس" اور ہفتہ وار اخبار
"جاگرن" بھی جاری کر دیا تھا ۔ پریس میں جو تھوڑا بہت نفع ہوتا بھی تھا وہ
ان پتروں میں اٹھ جاتا تھا، پھر بھی خرچ نہ چلتا تھا تو ادھر ادھر نوکری کرتے
تھے ۔ معاوضے پر مضمون اور کہانیاں لکھتے تھے ۔ مگر جو فرض انھوں نے
اپنے ذمے لے لیا تھا اسے جان کے ساتھ نبھاتے جا رہے تھے اور آخری
دم تک نبھاتے رہے ۔

---

[1] ذریعہ معاش [2] حالات [3] ایڈیٹر [4] جلدیں

ایڈیٹر

ادیب انسانیت کا، علویت کا، شرافت
کا علم بردار ہے۔ جو پامال ہیں، مظلوم ہیں، محروم
ہیں، چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت، ان کی حمایت
اور وکالت اس کا فرض ہے۔ اس کی عدالت
سوسائٹی ہے اس عدالت کے سامنے وہ اپنا
استغاثہ پیش کرتا ہے۔ (پریم چند)

پریم چند کا ایم اے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تو پورا نہ ہوا، لیکن انھوں نے جلد سمجھ لیا کہ پیشہ ور وکیل بننے کی بہ نسبت جنتا کا سچا اور انسان دوست وکیل بننا کہیں اچھا ہے۔ ادب کے ذریعے یہ فرض سرانجام دینے

کا کام انھوں نے اپنے ذمے لیا، کہانیاں اور ناول لکھ کر تو وہ مظلوم انسانیت کی وکالت کرتے ہی تھے۔ لیکن چاہتے تھے کہ جس عدالت میں انھیں اپنا استغاثہ پیش کرنا ہے اس کے دائرے کو اور وسیع کیا جائے۔ اس لئے ان کے دل میں ایک عرصے سے کسی رسالے کا ایڈیٹر بننے کی اُمنگ تھی۔ اُن کی زندگی کا یہ بھی ایک سنہرا سپنا تھا۔

۱۹۰۸ء میں جب وہ نواب رائے کے نام سے لکھتے تھے انڈین پریس الہ آباد کے پروپرائٹر چنتا منی گھوش نے انھیں کانپور سے بلایا تھا۔ ان کا ارادہ ایک ماہوار رسالہ نکالنے کا تھا اور وہ اس کی ادارت منشی نواب رائے کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ معاملہ کرکے پریم چند کانپور لوٹے تو احباب نے مشورہ دیا کہ ملازمت ترک کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ ایک سال کی رخصت لے لیں۔ اگر اس عرصے میں پرچہ چل گیا تو رہیں ورنہ پھر آکر ماسٹری کریں۔ یہ مشورہ انھیں ایسا پسند آیا۔ پرچے کا نام انھوں نے "فردوس" تجویز کیا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے تجویز التوا میں پڑ گئی پرچہ نکل نہیں سکا۔

ویسے وہ اس زمانے میں رسالہ "زمانہ" اور ہفتہ وار اخبار "آزاد" کے اعزازی اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ منشی دیانا رائن نگم کی دوستی اور شرافت کی خاطر انھیں اُن کے لئے بہت کچھ لکھنا پڑتا تھا۔ اس طرح انھوں نے ادارت کے قاعدوں اور اصولوں سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ اور انھی دنوں ایڈیٹر کے فرائض اور اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اپنی کہانی "ڈگری کے روپے" میں لکھتے ہیں :-

"اخبار کا ایڈیٹر ہمیشہ قاعدوں کے مطابق قوم کا خادم ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے کرتا ہے۔ قومی وسیع النظری سے جو کچھ سوچتا ہے اس پر بھی قومیت کی مہر لگی ہوتی ہے۔ ہمیشہ قومی خیالات کی وسیع فضا میں گھومتے رہنے سے شخصی اہمیت کا دائرہ اس کی نگاہوں میں بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ شخصیت کو ہیچ، حقیر اور ناقابلِ توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ شخصیت کو قومیت پر نچھاور کر دیتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد عظیم اور معیار پاکیزہ ہوتا ہے وہ ان زبردست شخصیتوں کا مقلد ہوتا ہے۔ جنھوں نے قوموں کو بنایا اور سنوارا ہے جن کا نام امر ہو گیا ہے جو مظلوم قوموں کے لئے نجات دہندہ ثابت ہو چکی ہیں وہ حتی الامکان کوئی کام ایسا نہیں کرتا جس سے اس کے پیش روؤں کی چمکتی ہوئی شہرت میں داغ لگ جانے کا اندیشہ ہو۔"

پریم چند نے ہمیشہ اس آدرش کو اپنے سامنے رکھا۔ ان کی کہانی "لعنت" کے ہیرو کاؤس جی بھی اسی آدرش کے مالک ہیں۔ لیکن آدرش بھی ہوا میں نہیں پلتے۔ ہر ایک آدمی کو آدرش کے ساتھ ہی اپنی مادی ضرورتیں بھی پوری کرنی پڑتی ہیں۔ اگر وہ پوری نہ ہوں تو آدرش بھی ڈگمگا جاتا ہے۔ کاؤس جی اخبار سے قوم کی خدمت کر کے شہرت تو حاصل کرتے ہیں، لیکن دولت سے محروم رہتے ہیں۔ روٹیوں تک کے لالے ہیں۔ پھر بیوی سے بھی نہیں بنتی۔ وہ بہت ہی تلخ مزاج واقع ہوئی ہے۔ اسے کاؤس جی کے آدرشوں سے کوئی ہمدردی نہیں صرف اپنی مادی ضرورتوں پر نظر رہتی ہے۔ اس حالت سے تنگ آ کر کاؤس جی اپنے پڑوسی شاپور جی کی دولت اور ان کی باسلیقہ اور

حسین بیوی شیریں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ پریم چند ان کی فطرت کے اس کمزور پہلو کو حقیقت کی روشنی میں دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حلوے کی جگہ چپڑی روٹیاں بھی ملیں تو آدمی صبر کر سکتا ہے۔ روکھی بھی مل جائے تو شاید وہ صبر کر لے۔ لیکن سوکھی گھاس سامنے دیکھ کر فرشتے بھی آپے سے باہر ہو جائیں گے"

پریم چند اپنے ہیرو کی اس فطری کمزوری کو چھپاتے نہیں۔ آگے بڑھنے کی چھوٹ دیتے ہیں۔ آخر جب شیریں اپنے دولتمند خاوند کی بے راہ روی اور بے مہریوں سے تنگ آکر اپنا ہاتھ کاؤس جی کے ہاتھ میں دینے کو تیار ہو جاتی ہے، کہتی ہے، مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ اب میں اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی تو ایک ایڈیٹر ہوش میں آتا ہے، اس کا ضمیر اسے تادیب کرتا ہے اُسے اپنی بے سروسامانی اور بیوی کی وفاداری یاد آتی ہے، وہ اپنی کجروی کا احساس کرتا ہے۔ اسے حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ یہ عیش و عشرت کی پروردہ تتلی شیریں اس کے ساتھ کٹیا میں کیسے رہ سکے گی۔ لکھتے ہیں:۔

"وہ کٹیا تو اسی لئے ہے کہ ایک ایڈیٹر عابدانہ محویت کے ساتھ حق اور انصاف اور آزادی کی پرستش کرے۔ امارت اور نفاست کے لئے وہاں جگہ کہاں؟"

اس حقیقت کو سمجھ کر اپنی بیوی گلشن کے ساتھ اپنے رویے کا خیال آتا ہے:۔

"ان کے آئین میں غصہ اور ہٹ دھرمی بہت بڑے گناہ تھے۔ پھر

وہ گلشن پر کیوں برہنہ شمشیر کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے۔ کیا اس لئے کہ وہ ان کی دست نگر ہے اور روٹھ جانے کے سوا انھیں اور کوئی سزا نہیں دی جا سکتی، کتنی کمینہ خود غرضی ہے کہ اقتدار اور اختیار والوں کے سامنے دُم ہلائیں اور جو اُن کے لئے اپنی زندگی قربان کر سکتی ہے اور کرتی ہے اُسے کاٹنے دوڑیں!!

پریم چند کاؤس جی جیسے با اصول ایڈیٹر کی کمزوری اور کج روی کو فطری تقاضا سمجھ کر معاف کر دیتے ہیں۔ بلکہ ان کے ہاں معافی کا تو سوال پیدا ہی نہیں ہوتا وہ اس کے جذبات سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں اور آخر میں اس کے ہاتھ میں آدرش کی شمع پکڑا کر اس کی انسانیت کے درجے کو وہ چند کر دیتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس جو لوگ محض نام و نمود کے لئے اور دولت کمانے کے لئے اخبار نکالتے ہیں، اور ان میں ایڈیٹر بننے کی کچھ بھی صلاحیت نہیں ذاتی اصلاح کا ذرا بھی مادہ نہیں، ایسے لوگوں کی پریم چند خوب گت بناتے ہیں "گئو دان" کا اونکار داس ایک ایسا ہی ایڈیٹر ہے۔ اس کے نزدیک اخبار نویسی کا مقصد دولت اور عیش و عشرت کے سامان حاصل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے وہ اپنے اخبار کے ذریعے بلیک میلنگ بھی کرتا ہے اور بڑے آدمیوں ـــــ مطلب اقتدار پسند طبقہ کی چاپلوسی بھی کرتا ہے اور پھر پارسائی اور اصول پرستی کا دم بھی بھرتا ہے۔ پریم چند مس مالتی کے ہاتھوں اس کی جھوٹی پارسائی اور زہد کا تمسخر اڑوا کر بے اختیار

قہقہہ بلند کرتے ہیں۔ اسے کاؤس جی کی طرح راستے سے نہیں لٹاتے۔ کیونکہ وہ ذلیل اور پست ہے، لوٹ ہی نہیں سکتا۔ اُسے اپنی اصلی جگہ پستی اور ذلالت کے گڑھے کی طرف پھسلتے دیکھ کر اور دھکیل دیتے ہیں اسے شراب پلا کر کہتے ہیں۔

"قانون بھی تو بندھن ہے اُسے کیوں نہیں توڑتے؟ بس وہی بندھن توڑ ڈالو جو اپنی ہوس رانیوں میں رکاوٹ ڈالتے ہوں ...."

پریم چند نے اپنے ذہن میں ایڈیٹری کا جو اعلیٰ معیار اور آدرش قائم کر لیا تھا اس پر وہ عمل بھی کرنا چاہتے تھے۔ یہ تبھی ہو سکتا ہے جب وہ مالک کی حیثیت سے اپنا اخبار نکالتے۔ کاروباری ڈھنگ اور منافع کی غرض سے جو اخبار اور رسالے نکل رہے تھے اُن کا ایڈیٹر بن کر اس جذبے کی تسکین ممکن نہیں تھی۔

پھر بھی ایڈیٹر نہ ہونے سے ایڈیٹر بننا اچھا تھا۔ اس لئے ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد جب ۲۲-۱۹۲۱ء میں انھیں "مریادا" کا ایڈیٹر بننے کی پیش کش کی گئی تو وہ انھوں نے ہنسی خوشی قبول کر لی اور ڈیڑھ سال تک اس پرچے کو نہایت خوبی سے مرتب کرتے رہے۔ لیکن کاروباری پرچوں میں خوبی کے مقابلے میں مصلحتوں پر زیادہ نظر رہتی ہے۔ چنانچہ اس نظام میں جیسے باپ کی وراثت بیٹے کو ضرور مل جاتی ہے۔ بابو سمپورن آنند کے جیل سے رہا ہوتے ہی انھیں "مریادا" کی ایڈیٹری سونپ دی گئی!"

پریس لگانے کا مدعا ہی یہ تھا کہ کتابیں چھاپنے کے علاوہ اپنا اخبار

اور رسالہ بھی نکالیں گے۔ لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے ان کا یہ خواب جلد پورا نہ ہوا بلکہ پریس چلانا بھی مشکل تھا۔ انھیں خود اپنی روزی کمانے کے لئے ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ جانا پڑا۔ وہاں وہ دار الاشاعت گنگا پستک مالا کے دفتر میں مرزا محمد عسکری وغیرہ کے ساتھ درسی کتابیں تیار کرنے کا کام کرتے رہے یہاں وہ دس ماہ سے زیادہ نہ رہ سکے۔ ایک تو تنخواہ بہت تھوڑی تھی، صرف سو روپے ماہوار ملتے تھے جس سے گذارہ نہیں چلتا تھا۔ پھر کام بھی طبیعت کے موافق نہیں تھا۔ اسکولوں کے لئے جس قسم کی کتابیں تیار کی جاتی تھیں وہ انھیں پسند نہ تھیں۔ وہ اپریل ۱۹۲۶ء میں پھر بنارس لوٹ آئے اور دو سال جون ۱۹۲۸ء تک وہیں رہ کر ناموافق حالات کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ مگر پریس سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا۔

جولائی ۱۹۲۹ء میں نول کشور پریس کے مالک منشی بشن نارائن نے انھیں پھر لکھنؤ بلا لیا۔ ان کے مطبع سے مشہور ہندی رسالہ "مادھوری" نکلتا تھا۔ پریم چند کو اس کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ اور وہ نومبر ۱۹۳۱ء تک نول کشور پریس میں مطبع کی مختلف خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس عرصے میں منشی بشن نارائن وفات پا گئے اور ان کی ریاست کورٹ آف وارڈز میں چلی گئی۔ پریم چند کو مطبع سے اپنا تعلق منقطع کرنا پڑا۔

"مادھوری" اب بھی نکلتا ہے۔ لیکن پریم چند کے زمانے میں اسے جو مقبولیت اور کامیابی حاصل ہوئی وہ اس رسالے کی تاریخ میں یادگار بن کر رہ گئی۔ پھر کبھی وہ بات نہیں بنی۔ رسالے کی مقبولیت کے سلسلے میں ایک

کہانی کا ذکر ضروری بھی ہے اور دلچسپ بھی ۔ پریم چند نے موٹے رام شاستری پر جتنا لکھا ہے ۔ مہاتما گاندھی پر بھی نہیں لکھا ہوگا۔ ۱۹۲۹ء میں اُن کی ایک کہانی "موٹے رام شاستری" کے نام سے شائع ہوئی، جسے پڑھ کر ایک شاستری مہاشے نے ان پر اور اُن کے دوسرے ساتھی ایڈیٹر کرشن بہاری مصر پر مقدمہ کر دیا۔ اس کہانی سے مادھوری کے مالک بشن نارائن بھی خوش تھے ۔ مقدمہ ٹھاٹھ سے لڑا گیا۔ دو بیرسٹر ڈیرہ دون سے آئے تھے کہانی کا اور اس مقدمے کا خوب چرچا ہوا۔ شاستری مہاشے مقدمہ ہار گئے جج نے اُن سے کہا "آپ کو کچھ اور کہنا ہے ۔ بہتر ہے کہ آپ کھڑکی کے راستے چپکے سے باہر نکل جائیں۔" پریم چند یہ سُن کر مسکرا دیے۔ "مادھوری" کا وہ پرچہ ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔

جب وہ مادھوری کے ایڈیٹر تھے، تبھی انھوں نے جنوری ۱۹۳۰ء میں اپنا پرچہ "ہنس" جاری کر دیا تھا جو اُن کے اپنے سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوتا تھا۔ پریم چند جانتے تھے کہ ایڈیٹر کا کام نئے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کی تخلیقی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ بیدار کرنے اور بڑھانے میں مدد دینا ہے ۔ چنانچہ نئے ادیبوں کی چیزوں کو بڑی محنت اور جاں فشانی سے اصلاح کر کے چھاپتے تھے اور دوستانہ اور پدرانہ شفقت کے ساتھ انھیں نیک مشورے دیتے اور ان میں مطالعہ کا شوق بڑھاتے تھے ۔ اس سلسلے میں ایک دو خط ملاحظہ ہوں جو انھوں نے اوپندر ناتھ اشک کے نام لکھے تھے ۔ اشک نے اِن دنوں لکھنا شروع کیا تھا اور "ہنس"

میں اپنی چیزیں چھپنے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔

گنیش گنج، لکھنؤ

پریہ بندھو ۲۵ر فروری ۱۹۳۲ء

آشیرواد! معاف کرنا، تمہارے دو خط آئے "بہشتی کی بیوی" میں نے پڑھا تھا اور بہت پسند کیا تھا۔ تم نے اردو کا ایک اور چھوٹا سا چٹکلا بھیجا تھا۔ میں اسے ہندی میں دے رہا ہوں۔ مگر ہندی میں جو چیزیں تم نے اب تک بھیجی ہیں، ان میں ابھی زبان کی بہت خامی ہے۔ ہندی کے پتر دیکھتے رہو گے تو سال چھ مہینے میں یہ ترٹیاں[1] دور ہو جائیں گی۔ کوئی کہانی ہمارے لئے ہندی میں لکھو۔ مگر کہانی ہو فینسی نہیں۔ اگر کسی مہان ویکتی[2] کا جیون چرتر[3] ہو تو اس سے بھی کام چل سکتا ہے۔ مگر میری صلاح تو یہی ہے کہ بہت زیادہ لکھنے کے مقابلے میں لٹریچر اور فلاسفی کا ادھین[4] کرتے جاؤ، کیونکہ اس وقت کا ادھین زندگی بھر کے لئے اپیوگی ہوگا۔

اور تو سب خیریت ہے

شبھیشی دھنپت رائے

گنیش گنج لکھنؤ

ڈیر اپندر ۲۳ر مارچ ۱۹۳۲ء

آشیرواد! کئی دن ہوئے تمہاری ہندی کہانی مل گئی۔ اس کے پہلے "پھول کا انجام" اردو کی چیز ملی تھی، میں اس ہندی کہانی میں ضروری سدھار

۱؎ نقائص ۲؎ بڑی شخصیت ۳؎ سوانح حیات ۴؎ مطالعہ

کرکے "ہنس" میں دے رہا ہوں۔ لیکن تم نے نریندر کو بلا کافی کارنوں کے شادی
کرنے پر آمادہ کر دیا۔ وہ شادی سے بیزار ہے وِواہِت جیون[1] کا درشیہ[2] دیکھ کر
اس کی طبیعت اور اداسین ہو جاتی ہے پھر یکایک وہ شادی کرنے پر تیار ہو جاتا
ہے محض اس لئے کہ اس کی منگنی ہو گئی ہے۔ شادی کے بعد کا جیون ضرور سندر
ہے۔ لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ جن میاں بیوی کو اس نے لڑتے دیکھا تھا، ان کا جیون
بھی یووَن[3] کی پہلی مدھوار رتوں[4] میں اتنا ہی آکرشک[5] نہ رہا ہوگا؟ انھیں کوئی ایسا
سین دکھانا چاہیئے تھا جس میں انسان کو اپنا اکیلا پن اسہیہ[6] ہو جاتا یا میاں
بیوی میں جنگ ہونے کے باوجود بھی ان میں ایسا چارترک سوندریہ[7] ہوتا
جو انسان کو شادی کی طرف جھکنے پر وِوش[9] کرتا۔ موجودہ حالت میں قصہ
CONVINCING وشواش پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ "پھول کا انجام"
اس سے اچھا ہے۔ اس میں ایک نکتہ ہے ایک چرستھائی[10] ستیہ ہے۔ لیکن
اردو سے کر میں کیا کروں!

پڑھنے کے لئے لائبریری سے سائیکلوجی کی کوئی کتاب لے لو، سکول
یا کورس کی کتاب نہیں۔ ابھی ایک کتاب نکلی ہے (THE ESPECTS
OF A NOVEL) اس وشے[11] پر اچھی کتاب ہے۔ مطلب صرف یہ کہ

---

[1] شادی شدہ زندگی [2] نظارہ [3] جوانی [4] خوش گوار موسم [5] دلکش
[6] ناقابل برداشت [7] کرداری حسن [9] مجبور [10] مستقل
[11] موضوع

انسان اُدار و وشالا[1] ہو جائے، اس کی سمویدنائیں[2] ویاپک[3] ہو جائیں۔ ڈاکٹر ٹیگور کے ساہتیک[4] اور دارشنک[5] نبندھ[6] بہت ہی اعلیٰ درجے کے ہیں۔ روماں رولاں کا "وویکانند" ضرور پڑھو۔ ان کی "گاندھی" بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ مارلے کے ساہتیک جیونیاں[7] لاجواب ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی درشن سمبندھی کتابیں، ٹالسٹائے کا WHAT IS ART وغیرہ کتابیں ضرور دیکھنی چاہئیں۔

اختر صاحب سے میرا سلام کہنا۔ میں ایک ہندی قصہ لکھ رہا ہوں اور وہ آپ کے لئے وقف ہے۔

تمہارا خیر اندیش دھنپت رائے

خط اور بھی ہیں لیکن دکھانا یہ مقصود ہے کہ پریم چند نئے لکھنے والوں پر اتنی محنت صرف کرتے تھے۔ خطوں میں ہی نہیں گھر پر بھی جو ادیب اپنی چیزیں دکھانے یا سنانے آتے تھے وہ انھیں ادبی نکات بڑے تحمل اور سلیقے سے سمجھایا کرتے تھے۔ یوں وقت ضائع کرتے دیکھ کر شیورانی دیوی نے چڑھ کر کہا تھا۔ تم نے کیا تمام دنیا کو سکھانے کا ٹھیکہ لیا ہے تو پریم چند نے ہنس کر جواب دیا تھا کہ یہی لوگ تو آئندہ چل کر ادب کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔ جب وہ ادب کو سماج کی بھلائی اور فائدے کی چیز سمجھتے تھے تو کیوں اسے تحریک بنانے کی کوشش نہ کرتے۔ ادبی تحریک کو تقویت پہنچانے کے لئے

---

[1] فراخ، وسیع [2] ہمدردیاں [3] ہمہ گیر [4] ادبی [5] فلسفیانہ [6] مضامین [7] سوانح عمریاں۔

تو "ہنس" نکالا تھا۔

"ہنس" اور "جاگرن" کے مضامین وہ بڑی محنت سے لکھتے تھے اور انھیں ہمیشہ باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ نکالنے کا خیال رکھتے تھے۔

۱۹۳۵ء کی بات ہے وہ کئی روز سے بیمار تھے۔ رات بھر بخار رہا کھانا تو کیا دودھ تک نہیں پیا۔ صبح چار بجے بخار اترا تو آپ ہمیشہ کی طرح ہاتھ منہ دھو کر "ہنس" کے لئے ایڈیٹوریل لکھنے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد شورانی دیوی نے آ کر جب انھیں لکھتے دیکھا تو وہ بہت ناراض ہوئیں پریم چند نے حسب عادت ہنس کر جواب دیا "مضمون نہیں لکھوں گا تو ہنس کیسے چھپے گا؟ "ہنس" اگر وقت پر نہیں نکلے گا تو گاہک کو پریشانی ہوگی۔ وہ یہ تھوڑا جانتا ہے کہ میں بیمار رہوں۔ اس نے پیسے دئے ہیں اور وہ وقت پر "ہنس" چاہتا ہے۔"

لیکن شورانی دیوی نہیں مانیں، کہا "اب لکھوگے تو قلم توڑ دوں گی کاغذ پھاڑ دوں گی پریم چند نے لاچار ہو کر کمپوزیٹر کو ایک گھنٹے میں دوبارہ آنے کی بات کہہ کر لوٹا دیا۔ شورانی سے پھر بولے۔ "تم نے مجھے لکھنے نہیں دیا۔ آدمی بیکار بیٹھے ہیں۔"

شورانی۔ تو ہنس کون موتی اگل رہا ہے۔

پریم چند ہنس کر بولے۔ صاحب ہنس موتی اگلتا نہیں، چنتا ہے۔

بحث پھر بھی جاری رہی۔ بیوی نے کہا "تم اتنا تیاگ کس لئے کر رہے ہو؟" پریم چند سادگی سے بولے۔ "تیاگ نہیں نشہ ہے۔ اگر میں یہ کام نہ

کروں تو مجھے تسکین نہیں ملتی۔

وہ اس دھن سے ہنس کو چلا رہے تھے۔ ہر ماہ لگ بھگ دو سو روپے ماہوار خسارہ رہتا تھا۔ کئی مرتبہ ادیبوں کو معاوضہ کا وعدہ کرکے مضامین حاصل کرتے تھے اس سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی مقصود ہوتا تھا۔ لیکن نقصان کے باعث دے نہیں پاتے تھے تو لکھنے والے ناراض ہو جاتے تھے۔ وہ انھیں پیار سے سمجھا دیتے تھے۔

اسی خرچ کے باعث بیچ میں ہنس انھوں نے ہندی پرشد والوں کو بھی دے دیا تھا۔ ایڈیٹر پریم چند خود تھے، لیکن پیسہ وہ لوگ خرچ کرتے تھے۔ لیکن وہ زیادہ دنوں خرچ برداشت نہیں کر سکے۔ آخر طے پایا کہ "ہنس" پریم چند سے بالکل لے لیا جائے اور پرشد اپنے انتظام میں نکالے۔ اس بات کا پریم چند کو جو دکھ ہوا وہ اختر حسین رائے پوری کے نام ان کے ایک خط سے ظاہر ہے۔ تاریخ نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۳۶ء میں لکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس سال گئودان چھپ گیا تھا اور پرشد نے "ہنس" اکتوبر ۱۹۳۵ء میں اپنے اہتمام میں لیا تھا۔

ڈیر اختر

تمھارا خط ملا، میں اس فکر میں تھا کہ تم نے اب تک میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ اب معلوم ہوا کہ تم پہاڑوں کی سیر کر رہے ہو۔

اب میرا قصہ سنو: میں قریب ایک ماہ سے بیمار ہوں، معدہ میں گیسٹرک السر کی شکایت ہے۔ منہ سے خون جاتا ہے، اس لئے کام کوئی نہیں

کرتا۔ دوا کر رہا ہوں، مگر ابھی تک تو کوئی افاقہ نہیں۔ اگر بچ گیا تو "بیسویں صدی" رسالہ آپ لوگوں کے خیالات کی اشاعت کے لئے ضرور نکالوں گا۔ "ہنس" سے تو میرا تعلق ٹوٹ گیا۔ مفت کی سر مغزی، بنیوں کے ساتھ کام کر کے شکریے کی جگہ یہ صلہ ملا کہ تم نے ہنس میں زیادہ روپیہ صرف کر دیا۔ اس کے لئے میں نے دل و جان سے کام کیا۔ بالکل اکیلا۔ اپنے وقت اور محنت کا کتنا خون کیا اس کا کسی نے لحاظ نہ کیا۔ میں نے "ہنس" ان لوگوں کو اس خیال سے دیا تھا کہ وہ میرے پریس میں چھپتا رہے گا اور مجھے پریس کی طرف سے گونہ بے فکری رہے گی۔ لیکن اب دہلی میں سستا ساہتیہ منڈل کی طرف سے نکلے گا اور اس تیاوے میں پرشد کو اندازاً پچاس روپے مہینے کی بچت ہو جائے گی، میں بھی خوش ہوں۔

جس لٹریچر کی اشاعت کر رہا تھا وہ ہمارا لٹریچر نہیں ہے وہ تو نرمی بھکتی والا مہاجنی لٹریچر ہے۔ جو ہندی زبان میں کافی ہے........

میرا ناول "گئو دان" حال ہی میں نکلا ہے۔ اس کی ایک جلد بھیج رہا ہوں۔ اردو میں ریویو کرنا۔ "میدانِ عمل" کا نسخہ تو تمہارے ہاں پہنچا ہی ہوگا۔ اس پر بھی لکھنا۔ "گئو دان" کے لئے میں ایک پبلشر کی تلاش کر رہا ہوں۔ مگر اردو میں تو حالت جیسی ہے تم جانتے ہی ہو بہت ہوا تو ایک روپیہ فی صفحہ کوئی دیدے گا۔

اور سب خیریت ہے، مولوی عبدالحق قبلہ کی خدمت میں میرا آداب کہنا

مخلص دھنپت رائے۔

ہندی پرشد اور سستا ساہتیہ منڈل گاندھی جی کی دیکھ ریکھ میں چل رہے تھے۔ "ہنس" لینے کا فیصلہ وار دھا کی ایک میٹنگ میں ہوا تھا جس میں پریم چند کو بھی بلایا گیا تھا۔

مگر پچاس روپے مہینے کی بچت دیکھنے والے بنئے "ہنس" کو موتی کہاں کھلا سکتے تھے۔ یہ تو پریم چند ہی کا بوتہ تھا۔ جون ۱۹۳۵ء کے پرچے میں سیٹھ گوبند داس کا ایک مضمون شائع ہوا جسے گورنمنٹ نے قابل اعتراض سمجھا اور ہنس سے ضمانت مانگ کی۔ پبلیشر نے ضمانت دینے سے انکار کر کے پرچہ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ پریم چند اس وقت بیمار تھے۔ انھیں پبلیشر کا یہ بنیاپن بہت ناگوار معلوم ہوا۔ انھوں نے فوراً ضمانت داخل کرائی اور پرچہ اپنی ملکیت میں لے کر جاری رکھا۔

اس سے پہلے بھی گورنمنٹ نے "ہنس" پر کئی حملے کئے تھے۔ اس کی اشاعت کے چھ ماہ بعد ہی جون ۱۹۳۰ء میں پہلی ضمانت مانگی گئی تھی جس کی وجہ سے پرچہ بند ہو گیا۔ لیکن جنوری ۱۹۳۱ء میں آرڈیننس ختم ہو گیا تو پھر جاری کر دیا مگر دو ہی تین نمبر نکلے تھے کہ پریم چند کی "قاتل" کہانی کی اشاعت کی بنا پر ضمانت مانگی گئی، لیکن بنارس کے کلکٹر کی سفارش پر حکومت نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ اور "ہنس" بدستور چلتا رہا۔

پریم چند نے ہر قیمت پر ہنس کو قائم رکھنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ مرتے دم بھی اگر انھیں کوئی فکر تھی تو یہی کہ میرے بعد ہنس کیسے زندہ رہے گا وہ اسے اپنے "بیٹے" کی طرح پیار کرتے تھے۔ "ہنس" اور "جاگرن" کو زندہ

رکھنے کے لئے انھیں سنہ ۱۹۳۴ء میں فلم کی ملازمت قبول کرنا پڑی تھی

ان کے بعد شورانی دیوی نے اور ان کے لڑکے امرت رائے نے ہنس کو بدستور زندہ رکھا ہے اور "ہنس" پریم چند کی ترقی پسند روایتوں کا علمبردار ہے، جس کی وجہ سے پاٹھکوں کو اس کے ساتھ دلی انس پیدا ہو گیا ہے مالی مشکلات کے باعث امرت رائے نے دسمبر سنہ ۱۹۴۸ء میں ہنس کو چھ ماہ کے لئے بند رکھنے کا اعلان کیا تو پاٹھکوں نے اس فیصلے کی زبردست مخالفت کی اور پروٹسٹ کے خط لکھے۔ پٹنہ کے ایک پاٹھک کا خط ملاحظہ ہو:-

" میں ایک عرصے سے ہنس کا پاٹھک رہا ہوں۔ ہنس جو نیتی برتتا رہا ہے اس کا میں قائل ہوں۔ ہنس "کانگریس" ڈھنگ سے جنتا کی سیوا کرنے کا ڈھونگ نہیں کرتا رہا ہے۔ اس نے طبقہ واری تقسیم کو سمجھا ہے اور جنتا کی سیوا کرنے کی اس میں سچی لگن ہے۔ آج جب ہمیں رجعت پرستی پر، جو ہمارے چاروں طرف موجود ہے اور جو اپنا خونی پنجہ اور مضبوط کرنا چاہتی ہے، چوطرفہ حملہ کرتا ہے ہنس رجعت پرستی کے حلقے کو توڑنے کے لئے ہمارے ہاتھ میں ایک بہت ہی مضبوط ہتھوڑا ہے۔"

اس ہتھوڑے کی ضربوں سے گھبرا کر یوپی کی کانگریس سرکار نے مئی سنہ ۱۹۴۹ء میں ہنس کے ایڈیٹر امرت رائے کو ایک نوٹس دیا جس میں "ہنس" پر فرقہ داری اور اشتعال انگیزی کا الزام لگا کر پرچے کو بند کرنے کی دھمکی دی تھی۔ ہندی اور اردو کے تمام سنجیدہ اور انسان دوست ادیبوں اور ایڈیٹروں نے کانگریس سرکار کے اس فعل کی مذمت کی اور "ہنس" کو

اس حملے سے محفوظ رکھا۔

اس کے باوجود خانگی جھگڑوں کے باعث "ہنس" چھ ماہ سے بند ہے معلوم ہوا ہے کہ اب امرت رائے نے بڑے بھائی شری پت رائے سے بٹوارہ کرکے اپنے حصے کا پریس الگ لگا لیا ہے۔ "ہنس" اس پریس میں پھر چھپنے لگے گا۔

امرت رائے ہی نقصان کے باوجود پہلے چلا رہے تھے اور اب بھی چلائیں گے، کیونکہ طبقاتی جدوجہد کے اس زمانے میں "ہنس" کی سخت ضرورت ہے۔ پریم چند نے جس منزل کی طرف اشارہ کیا تھا امرت رائے بڑی مستعدی سے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ "ہنس" ان کے اور دوسرے ادیبوں کے ہاتھ میں ہتھوڑا ہے جس سے وہ راستے کی چٹانوں کو توڑ سکتے ہیں۔ راہ یہ ہے جو پریم نے اپنے بورژوا کلچر (مہاجنی تہذیب) مضمون میں دکھائی تھی۔

"اس کلچر نے سماج کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ جن میں ایک ہڑپنے والا ہے، دوسرا ہڑپا جانے والا ہے۔ اس بورژوا تہذیب کا خاتمہ ہوا ہے صرف روس میں اور جو سماجی نظام اس ملک کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا ہے وہ ہندوستان کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔"

سمر یاترا

اگر آدمی جدو جہد سے گھبرائے تو
بزدل ہے (پریم چند)

پریم چند نے "سوز وطن" ۱۹۰۸ء میں لکھی تھی۔ اس وقت ملک میں تقسیم بنگالہ کی تحریک چل رہی تھی۔ اس کتاب کا مقصد اس تحریک کو آگے بڑھانا اور ہم وطنوں کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبے کو تقویت دینا تھا۔ حکومت نے اسے ضبط کر لیا تھا اس کتاب کے بائیس تئیس سال بعد انھوں نے کہانیوں کی ایک کتاب پھر لکھی جس کا نام "سمر یاترا" تھا اس وقت ملک میں عدم تعاون کی تحریک چل رہی تھی۔ اس کتاب کا مقصد اس تحریک کو آگے بڑھانا اور آزادی کی جدو جہد کو تیز کرنا تھا۔ اس کتاب کو بھی حکومت

نے ضبط کر لیا۔

۱۹۰۵ء میں آزادی اور دیس بھگتی ایک رومانی تصور تھا۔ آدمی
کے دل میں یہ جذبہ اس لئے پیدا ہونا چاہیے کہ اسے ہیرو بننا ہے اپنی ذات
کو بلند کرنا ہے۔ جس کے دل میں یہ جذبہ نہیں ہے وہ انسان کہلانے کا مستحق
نہیں ہے۔ آزادی یعنی سوراج اس کا پیدائشی حق ہے۔ بس ایسی ہی باتوں
اور نعروں پر اس جذبے کی بنیاد قائم تھی۔ یہ جذبہ میزینی اور گیری بالڈی
وغیرہ دوسرے ملکوں کے دیس بھگتوں سے مستعار لیا جا سکتا تھا چنانچہ
پریم چند نے "سوزِ وطن" کی کہانیوں کی طرح جذباتی انداز سے اس وقت
میزینی اور گیری بالڈی وغیرہ کے سوانح حیات بھی لکھے تھے۔ تحریکِ آزادی
کے اقتصادی پہلوؤں پر بالکل غور نہیں کیا جاتا تھا جس طرح آزادی اور
حب الوطنی کا یہ ہوائی تصور ناقص ہے اسی طرح وہ کہانیاں بھی خام
تھیں۔

لیکن ۱۹۳۰ء تک ہماری جنگِ آزادی بہت سی منزلیں طے کر چکی تھی
وہ صرف بحث کرنے والے وکیلوں، برطانیہ سے مراعات مانگنے والے تاجروں
اور درمیانہ طبقے کی تحریک نہیں رہی تھی۔ اقتصادی سنکٹ محنت کش
عوام کی کمر توڑ رہا تھا۔ کسان مزدور آزادی کی تحریک میں کھنچے چلے آ رہے تھے
دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ روس کا مزدور انقلاب
بورژوا طبقہ کی تمام مزاحمت کو ختم کر کے دنیا بھر سے مزدور اور محنت کش
طبقے کی لافانی عظمت کا لوہا منوا چکا تھا، اور اب روس پنج سالہ اقتصادی

منصوبہ بنا کر خوش حالی کی طرف بڑھ رہا تھا، دنیا بھر کے پڑھے لکھے نوجوان اور انسان دوست دانش ور روس کے نئے نظام سے متاثر ہوئے تھے۔ ہمارے دیس میں بھی گرم دل نوجوانوں کی پارٹیاں بن رہی تھیں۔

پریم چند تو پہلے ہی اس انقلاب کا سواگت کر چکے تھے۔ اب مزدوروں کسانوں کی کامیابیاں دیکھتے تو اور بھی خوش ہوتے تھے اور اپنے ملک میں حکمراں اور سرمایہ دار طبقے کی لوٹ کھسوٹ ختم کرنے کے لئے روسی طرز کے نظام حکومت کی تائید کرتے تھے۔

غالباً نومبر ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ پریم چند لکھنؤ میں تھے۔ وائسرائے وہاں آیا، یوپی کے زمینداروں نے اس کا خوب استقبال کیا اور اس کی آمد کی خوشی میں رات کو چالیس ہزار روپے کی آتش بازی جلانے کا انتظام تھا۔ پریم چند نے گھر جا کر ذکر کیا تو شورانی بولیں کہ ہم نے تو اتنی بڑی آتش بازی کبھی نہیں دیکھی کیا آپ دیکھنے چلیں گے؟

پریم چند بولے، ہاں کیوں نہیں چلوں گا۔ غریبوں کا گھر پھونک تماشہ دیکھا جائے گا۔

شورانی دیوی اس وقت نہیں سمجھتی تھیں کہ اس میں غریبوں کا گھر پھنکتا ہے ان کا خیال تھا کہ بڑے بڑے زمیندار رائے بہادر اور خان بہادر یہ سارا انتظام کرتے ہیں اور انھی کا پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ لیکن پریم چند نے انھیں بتایا کہ دیس میں جو ۸۰ فی صدی کسان اور کچھ دوسرے محنت کش لوگ بستے ہیں اُن کی محنت سے یہ دولت پیدا ہوتی ہے۔ ایک طرف تو محنت

کرنے والوں کو دو جونکی روکھی روٹیاں بھی نہیں ملتیں اور دوسری طرف یہ لوگ صرف اس اُمید میں کہ وائسرائے خطاب دے گا، چالیس چالیس پچاس پچاس ہزار روپیہ آتش بازی میں پھونک دیتے ہیں۔ انگریز اور اُن کے پٹھو ناحق غریبوں کا خون چوستے ہیں۔

اس کے بعد جو بحث شروع ہوتی ہے اُسے شورانی اپنی کتاب "پریم چند گھر میں" یوں بیان کرتی ہیں۔

میں بولی :۔ جب سوراج ہو جائے گا۔ تب کیا چوسنا بند ہو جائے گا۔
آپ بولے :۔ چوسا تو تھوڑا بہت ہر جگہ جاتا ہے۔ یہی شاید دنیا کا نیم ہو گیا ہے کہ کم زور کو شہ زور چوسیں، ہاں روس ہے جہاں پر کہ بڑوں کو مار مار کر درست کر دیا گیا، اب وہاں غریبوں کو آنند ہے۔ شاید یہاں بھی کچھ دنوں کے بعد روس جیسا ہی ہو۔
میں بولی :۔ کیا آشا ہے کچھ ؟
آپ بولے :۔ ابھی جلدی اس کی آشا نہیں۔
میں بولی :۔ مان لو کہ جلدی ہی ہو جائے، تب آپ کس کا ساتھ دیں گے ؟
آپ بولے :۔ مزدوروں اور کاشتکاروں کا۔ میں پہلے ہی سب سے کہہ دوں گا کہ میں بھی مزدور ہوں، تم پھاوڑا چلاتے ہو، میں قلم چلاتا ہوں، ہم دونوں برابر ہی ہیں۔
میں ہنس کر بولی : اس طرح کہنے سے کام نہیں چلے گا، وہ تمھارا وشواس نہیں کریں گے۔

وہ بولے :۔ تب تک سب لکھ پڑھ جائیں گے ۔ کیا روس میں لیکھک نہیں ہیں؟ وہاں کے لیکھکوں کی حالت یہاں کے لیکھکوں کی حالت سے کئی گنا اچھی ہے ۔ میں تو اس دن کے لئے مرتا ہوں کہ یہ دن جلدی آئے ۔

میں بولی : تو روس والے یہاں بھی آئیں گے ؟

وہ بولے :۔ روس والے یہاں نہیں آئیں گے ، بلکہ روس والوں کی شکتی ہم لوگوں میں آئے گی ۔

میں بولی :۔ وہ لوگ اگر یہاں آتے ، تو شاید ہمارا کام جلدی ہو جاتا ۔

وہ بولے :۔ وہ لوگ یہاں نہیں آئیں گے ، ہمیں لوگوں میں وہ شکتی آئے گی ، وہ ہمارے سکھ کا دن ہوگا ۔ جب یہاں مزدوروں اور کاشتکاروں کا راج ہوگا ۔ میرا خیال ہے کہ آدمیوں کی زندگی اوسطاً دونی ہو جائے گی ۔

میں بولی :۔ وہ کیسے ہوگا ؟

آپ بولے :۔ سنو وہ اس طرح ہوگا کہ ابھی ہم کو رات دن محنت کرنے پر بھی بھر پیٹ آرام سے روٹیاں نہیں ملتیں ۔ رات دن کچھ نہ کچھ فکر ہمیشہ رہتی ہے ۔

میں بولی :۔ تو فکر ہم لوگ اپنے آپ ہی تو کرتے ہیں ۔ مزدوروں کا راج ہونے پر کیا ہم لوگوں کو فکروں سے چھٹی مل جائے گی ؟

آپ بولے :۔ کیوں نہیں چھٹی ملے گی ؟ ہم کو آج معلوم ہو جائے کہ ہمارے مرنے کے بعد بھی ہمارے بیوی بچوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی ، اور اس

کی ذمہ داری ہمارے سر پر نہیں بلکہ راشٹر کے سر پر ہے۔ تو ہمارا کیا سر پھر گیا ہے کہ ہم اپنی جان کھپا کر دن رات محنت کریں اور آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ کاٹ کر اپنے پاس جمع کرنے کی کوشش کریں؟ ہم کو آج معلوم ہو جائے کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارے بال بچوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ تو ایسا کون آدمی ہے کہ آرام سے کھانا پہننا نہیں چاہے گا۔"

ظاہر ہے کہ پریم چند کے دل میں انسان کے عظیم مستقبل کا یقین بڑھ گیا تھا اور اُن کے ذہن میں آزادی کا صحیح اور واضح تصور پیدا ہو گیا تھا اب وہ اسی آزادی کے لئے لکھ رہے تھے اور جد و جہد کر رہے تھے پنڈت بنارسی داس چترویدی ایڈیٹر وشال بھارت نے اُن سے دریافت کیا تھا کہ آپ کی تمنائیں کیا ہیں؟ اس کے جواب میں اُنھوں نے جون ۱۹۳۰ء میں لکھا تھا کہ:-

"میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگِ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہش مند نہیں ہوں۔ کھانے کو مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں۔ ہاں، یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں، لیکن اُن کا مقصد بھی حصولِ آزادی ہی ہو .... میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ سے دھیان ہے۔

سونے روپے سے لدا ہوا آدمی کسی بھی حیثیت سے بڑا نہیں ہوتا۔ دولت مند آدمی کو دیکھتے ہی آرٹ اور علم کے متعلق اس کے بلند بانگ بڑ بولوں کو میں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص نے اس سماجی نظام کی تائید کی ہے جو امیروں کے ہاتھوں غریبوں کی خون آشامی پر قائم ہے۔ ایسا کوئی بڑا نام مجھے متاثر نہیں کر سکتا جو دولت کا پجاری ہو۔ ممکن ہے کہ میری ناکام زندگی نے میرے جذبات کو اتنا تلخ بنا دیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بنک میں کوئی موٹی رقم جمع کرنے کے بعد شاید میں بھی ان جیسا ہو جاتا اور لالچ کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ لیکن مجھے فخر ہے کہ فطرت اور قسمت نے میری مدد کی اور مجھے غریبوں کا شریک غم بنا دیا۔ اس سے مجھے روحانی تسکین ملتی ہے"

"جب نان کوآپریشن کے آخری دنوں میں سوراج پارٹی قائم ہوئی تو ۱۷ فروری ۱۹۲۸ء کو ایڈیٹر زمانہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کس پارٹی کے ساتھ ہوں۔ میں کسی پارٹی میں نہیں ہوں اس لئے کہ اس وقت دونوں میں کوئی پارٹی عملی کام نہیں کر رہی ہے میں اس آنے والی پارٹی کا ممبر ہوں، جو عوام الناس کی سیاسی تعلیم کو اپنا دستور العمل بنائے گی ...."

ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ ان کی زبردست خواہش تھی کہ عوام اُبھریں۔ جب یہ دیکھتے تھے کہ اپنے ہی ملک کے پڑھے لکھے لوگ اور سرمایہ دار طبقہ انھیں جاہل بنا کر لوٹ رہا ہے تو وہ اس کے

مقابلے میں عوام کی حمایت کرتے تھے اور ہر طرح کی لوٹ کھسوٹ ختم کرنا
چاہتے تھے۔ امیر طبقے کی خود غرضی دیکھ کر انھیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ
آزادی کی جدوجہد بھی عوام ہی لڑیں گے۔ اس لڑائی میں امیر طبقہ کبھی عوام
کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ ان سے دھوکا کرے گا۔ "رنگ بھومی" (چوگان
ہستی) میں کنور بھرت سنگھ جب جائداد کے موہ میں تحریک سے غداری
کر گئے تو پریم چند لکھتے ہیں کہ "صاحب جائداد کبھی آزادی کی جنگ نہیں لڑ
سکتے جو سپاہی سونے کی اینٹ گلے میں باندھ کر میدان جنگ میں آئے گا
وہ کیا خاک لڑے گا اسے تو اپنی اینٹ ہی کا خیال رہے گا۔"

تحریک آزادی کا یہ نیا تصور تھا جو "سوز وطن" کی حب الوطنی سے
بالکل مختلف تھا۔ اس جذبے کی محرک عوام کی لوٹ کھسوٹ اور بے کسی
تھی اور انھی کو اپنی سیاسی مشکلات کا حل کرنے کے لئے یہ جنگ لڑنی
تھی اور سوراج کا مطلب تھا لوٹ کھسوٹ اور ظلم کو ختم کرنا۔ "سمر یاترا"
کی کہانیوں کو دیکھا جائے تو آزادی کا یہ تصور بہت ہی واضح صورت میں
ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

اس مجموعے کی ایک کہانی "آشیاں برباد" تھی۔ اس کہانی میں
مردلا اور چھما دیوی دو عورتیں ہیں جو عدم تعاون کی تحریک میں جیل جاتی
ہیں، چھما دیوی پہلے جیل میں ہے اور مردلا دیوی بعد میں آکر اسے باہر
کے حالات سناتی ہے۔

"اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی بہن۔

باہر کی خبریں کیا معلوم ہوں گی۔ پرسوں شہر میں گولیاں چلیں۔ دیہاتوں میں آج کل لگان وصول کیا جا رہا ہے۔ کسانوں کے پاس روپیہ ہے نہیں غلہ ارزاں ہو گیا ہے اور دن بدن گرتا جا رہا ہے۔ پونے دو روپے میں من بھر گیہوں آتا ہے۔ میری عمر ہی کیا ہے۔ اماں بھی کہتی ہیں غلہ اتنا سستا پہلے کبھی نہ تھا۔ کھیتوں کی پیداوار سے بیجوں کے دام تک نہیں آتے۔ سینچائی اور محنت سب اوپر۔ غریب کہاں سے دیں۔ سرکار کا حکم ہے کہ جیسے بھی ہو لگان وصول کیا جائے۔ کسان اس پر راضی ہیں کہ ہمارے مال اسباب قرق کر لو، اپنی زمین لے لو۔ مگر یہاں تو حاکموں کو اپنی کارگزاری دکھانے کی فکر لگی ہوئی ہے۔ زمینداروں نے کہہ دیا ہم سے وصول نہیں ہوگا۔ اب پولیس بھیجی گئی ہے۔ بھیروں گنج کا علاقہ پیسا جا رہا ہے!"

اس دور کے اقتصادی سنکٹ کی پوری تصویر ہے۔ جب اناج کوڑیوں کے بھاؤ بکتا تھا تو کسان لگان کہاں سے دیتے؟ اور اُدھر کساد بازاری کے مارے دوکاندار اور درمیانہ طبقے کی کمر ٹوٹ رہی تھی، بے کاری میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا جس سے ملک میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ لاوا ابلتا ہے تو بھونچال آتا ہی ہے، جمود ٹوٹتا ہے۔ ملک میں بھوک کا لاوا ابل رہا تھا اور اقتدار پسند طبقے کا سنگھاسن ڈول رہا تھا۔

انھی حالات میں گاندھی نے نمک تحریک شروع کی تھی اور ڈانڈی کو مارچ کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ میں لوٹوں گا تو آزادی لے کر ورنہ میری لاش سمندر میں تیرتی نظر آئے گی۔

لوگوں نے اس بات کو سچ سمجھا اور سارا دیس حرکت میں آ گیا۔ نمک کا قانون توڑا جانے لگا۔ ولائتی کپڑے جلائے جانے لگے۔ بدیشی کپڑے اور شراب کی دکانوں پر پکٹنگ ہونے لگی اور جیلیں بھری جانے لگیں۔ پریم چند بھی جیل جانے کو بے قرار تھے، لیکن ان سے پہلے شورانی دیوی چلی گئیں۔ اب اگر پریم چند بھی جائیں تو پیچھے بچوں کو کون سنبھالے گھر کا کیا بنے؟ اس لئے جیل جانے کی حسرت دل میں رہ گئی۔

ان کے دل میں جنگ آزادی میں شامل ہونے کا جو زبردست جذبہ تھا اس کا اظہار انھوں نے "سمریا ترا" کی کہانیوں میں کیا۔ اگرچہ یہ جنگِ آزادی بھی گاندھی کی قیادت میں اور اہنسا کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے لڑی جا رہی تھی اور پریم چند گاندھی کی لیڈر شپ کو قبول کرتے تھے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان کہانیوں میں گاندھی ازم سے زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کے ذہن میں شبہہ ہی نہیں بلکہ پورا یقین تھا کہ صرف اہنسا سے اور محض جلوس نکال کر آزادی نہیں آئے گی۔ اس بات کی دلیل "قاتل" کہانی ہے۔ اس میں ماں بیٹے کا مکالمہ سنئے۔ ماں ستیا گرہ کی قائل اور بیٹا دہشت پسند ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں:۔

دھرم ویر:۔ مجھے امید نہیں کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہو سکے یہ اپنی کمزوری اور معذوری کا صریحی اعلان ہے۔ جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں آزاد نہیں ہوا کرتیں .... مجھے تو یہ طرزِ عمل بچوں کا سا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں کو رونے دھونے

سے مٹھائیاں ملا کرتی ہیں۔ وہی ان لوگوں کو مل جائے گا۔ اصلی آزادی
جبھی ملے گی جب ہم اس کی قیمت دینے کو تیار رہیں گے۔

مالی :۔ اس کی قیمت کیا ہم نہیں دے رہے ہیں۔ ہمارے لاکھوں آدمی جیل
نہیں گئے؟ ہم نے ڈنڈے نہیں کھائے؟ ہم نے اپنی جائدادیں نہیں
ضبط کرائیں؟

دھرم ویر :۔ اس سے انگریزوں کا کیا نقصان ہوا۔ وہ ہندوستان
اس وقت چھوڑیں گے۔ جب انھیں یقین ہو جائے گا کہ اب ہم یہاں
ایک لمحہ پھر بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار
انگریز قتل کر دیے جائیں تو آج سوراج مل جائے۔ روس اس طرح
آزاد ہوا۔ آئرلینڈ اس طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح
آزاد ہوگا ......"

اس کہانی کی بنا پر ۱۹۳۲ء میں "ہنس" سے ضمانت طلب کی گئی تھی
پریم چند اس بات کو بھی نہیں مانتے کہ لاٹھیاں اور گولیاں کھاتے
جائیں۔ آخر انگریز کا دل پسیج جائے گا اور وہ حکومت انھیں سونپ کر چلے
جائیں گے۔

"آشیاں برباد" کہانی میں پہلے دن جلوس نکلتا ہے۔ گولیاں چلتی
ہیں۔ بہت سے آدمی ہلاک ہوتے ہیں۔ جلوس دوسرے دن پھر نکلتا ہے۔
پریم چند اس کی تائید میں لکھتے ہیں۔

"لوگ کہتے ہیں۔ جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا

ہے ہم زندہ ہیں۔ مستعد ہیں۔ میدان سے ہٹے نہیں۔ ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا ہے۔ یہ دکھا دینا ہے کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبۂ آزادی سے دست بردار ہو جانے والے نہیں۔ ہم اس نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں جس کی بنیاد ظلم اور خود غرضی اور خون چوسنے پر رکھی گئی ہے۔

"اور پولیس نے جلوس کو روک کر اپنی زندگی اور قوت کا ثبوت دینا بھی ضروری سمجھا۔ شاید ملک کو دھوکا ہو گیا ہو کہ کل کے واقعہ سے سرکار میں احساس اخلاق پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنی حرکت پر نادم ہے، پبلک کے اس وہم کو دور کرنا اس نے اپنا فرض سمجھا۔ وہ یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں اور حکومت کریں گے۔"

انھیں کانگریس لیڈروں کی پالیسی کی تہہ میں سمجھوتہ بازی بھی نظر آنے لگی تھی اور انھیں شک ہو گیا تھا کہ ان کے لائے جو سوراج آئے گا اس میں بھی لوٹ کھسوٹ جاری رہے گی۔ اُن کی "جیل" کہانی کی ہیروئن ایک سمجھدار لڑکی کانگریس کی اس بورژوا سیاست کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔

"اگر سوراج آنے پر بھی جائداد کی ہی حکمرانی رہے اور تعلیم یافتہ طبقہ یوں ہی خود غرض بنا رہے تو میں کہوں گی ایسے سوراج کا نہ آنا ہی اچھا ہے۔ انگریزی مہاجنوں کی ہوس زر اور تعلیم یافتہ طبقہ کی خود پروری آج ہمیں پیسے ڈال رہی ہے۔ جن برائیوں کو دور کرنے کے لئے آج ہم جان ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں۔ انھیں برائیوں کو پرجا کیا اس لئے سر چڑھائے گی کہ وہ بدیشی نہیں سودیشی ہیں۔ کم از کم میرے لئے تو سوراج کا یہ مطلب نہیں

ہے کہ جان کی جگہ گرہ بند بیٹھ جائے۔"

یہ پیش گوئی تھی "سمر یاترا" کی کہانیوں سے صرف انگریزی حکومت پر ہی نہیں۔ سرمایہ دار طبقہ اور کانگریس کی بورژوا سیاست پر بھی زبردست چوٹ پڑتی ہے۔ انگریزی حکومت نے سمجھ لیا تھا کہ گاندھی کی نمک تحریک سے یہ کتاب زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے اسے ضبط کر لیا گیا۔

ناول "میدانِ عمل" بھی اسی تحریک سے متعلق ہے اور انھی دنوں لکھا گیا ہے۔ مگر اس پر گاندھی ازم کی چھاپ بہت گہری ہے۔ ساری تحریک کی رہنمائی اونچا طبقہ کے لوگ کرتے ہیں اور اپنسانادی ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ پھر حیرت یہ ہے کہ غلاظت کے پتلے چوری کا مال کھانے والے سمر کانت اور دھنی رام جیسے سیٹھوں کا تالیف قلب بھی ہو جاتا ہے۔ شاید پریم چند کی ابھی تک اس طبقہ سے کچھ امیدیں وابستہ تھیں، شاید انھیں گاندھی کے فلسفہ کی تائید کرنا مقصود تھا ورنہ وہ اسی ناول میں لکھتے ہیں:۔

"سرمایہ ہی تو دنیا میں ہر قسم کی غلامی کو قائم رکھے ہوئے ہے"

فلم

دل کو سمجھانے کے لیے دلائل
کی کمی نہیں ہوتی۔ دنیا میں آسان
ترین کام خود کو دھوکا دینا ہے (پریم چند)

ایک مرتبہ پریم چند اور اُن کی بیوی ڈیوڑھے درجے میں سفر کر رہے تھے
آج کل کی طرح ان دنوں بھی گاڑیوں میں بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ بہت سے کسان
اُن کے ڈبے میں گھس آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سنگم وغیرہ کے
درشن کرنے گئے تھے اور ایک ایک آدمی کے کم سے کم پندرہ روپے خرچ ہو
گئے۔ کسان کے لیے ان دنوں پندرہ روپے بڑی بات تھی۔

پریم چند سمجھانے لگے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم لوگوں نے چار چار
مہینے کے کھانے کا غلّہ بیچ دیا۔ اس سے اچھا ہوتا کہ دیوی جی کی پوجا تم

بوٹ گھر پر ہی کر لیتے۔ دیوی دیوتا بھی خوش ہوتے ہیں جب تم آرام سے رہو

شورانی دیوی چاہتی تھیں کہ کسان کسی طرح تیسرے درجے کے ڈبے میں چلے جائیں کیونکہ وہاں بھیڑ زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ بولیں، "پھر سمجھا لینا میرا تو دم گھٹا جا رہا ہے"

پریم چند نے جواب دیا۔ "انھی کے لئے جیل جاتی ہو، لڑائی لڑتی ہو، اور انھی کو ہٹا رہی ہو، مجھے تو ان غریبوں پر رحم آ رہا ہے، بے چارے بھوکوں دھرم کے پیچھے مر رہے ہیں۔

شورانی:۔ تو گاڑی میں بیٹھے نہیں سیکھ جائیں گے؟

پریم چند:۔ آخر تب کب سمجھایا جائے؟

شورانی:۔ آپ انھی کے لئے تو ڈھاکا پوتھا لکھ رہے ہیں۔

پریم چند:۔ "کتابیں لے کر تھوڑا ہی پڑھتے ہیں۔ ہاں میرے ناولوں کے فلم تیار کر کے گاؤں گاؤں مفت دکھائے جاتے تو لوگ دیکھتے"

یہ ۱۹۲۷ء کا واقعہ تھا، اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں بمبئی کی اجنتا سینے ٹون فلم کمپنی نے انھیں بلایا۔ پریم چند نے اس موقع کو غنیمت سمجھا، بمبئی جانے کے لئے تیار ہو گئے، کیونکہ اس سے معقول آمدنی کی توقع تھی "ہنس" اور "جاگرن" دو پرچے نکل رہے تھے۔ اخراجات بڑھے ہوئے تھے۔ انھیں چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ شورانی دیوی سے مشورہ کیا تو انھوں نے منع کر دیا۔

آپ بولے:۔ "تمھیں سوچو، بنا جائے کام بھی تو نہیں چل سکتا، یہاں جو کچھ آمدنی ہوتی ہے، اپنے پر خرچ ہو جاتی ہے، یہ "ہنس" اور "جاگرن" کیسے چلیں؟

شورانی :۔ تو پھر ان کے لئے بھی میں بمبئی جانا ٹھیک نہیں سمجھتی۔

وہ بولے :۔ اب جو ان ہاتھیوں کو گلے سے باندھا ہے تو کیا ان کو چارہ نہیں دوگی؟ آخر ان کو بھی تو زندہ رکھنا ہے۔

شورانی :۔ آپ جو بھی کام کرتے ہیں، جان کی مصیبت مول لے لیتے ہیں۔

وہ بولے :۔ ارے صاحب ان باتوں کا رونا تو پچاسوں بار ہو چکا ہے اب جب ان کو باندھ لیا ہے تو ان کو چلانا ہی ہوگا، اور ایک بات بتاتا ہوں، جو وہاں جانے کا خاص فائدہ ہوگا وہ یہ کہ ناول اور کہانیاں لکھنے میں جو فائدہ نہیں ہو رہا، اس سے کہیں زیادہ فلم دکھا کر ہو سکتا ہے، کہانیاں اور ناول جو لوگ پڑھیں گے وہ تو ان سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ فلم سے ہر جگہ کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

شورانی :۔ لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، مجھے کیا فائدہ ہوگا؟

پریم چند :۔ یہی تو تمھاری غلطی ہے۔ لوگوں کے فائدے کے لئے میں تھوڑے ہی لکھتا ہوں؟ اپنی روح کی تسکین کے لئے جو کچھ لکھتا ہوں اسے جتنے ہی لوگ تعداد میں زیادہ سمجھ سکیں، دیکھ سکیں، پڑھ سکیں، اتنا ہی مجھے زیادہ تسکین ملے گی، اور اس کے بعد دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ "ہنس"، "جاگرن" کے چلانے کے لئے میں زیادہ روپیہ دے سکوں گا تو ہزار روپے سال وہ دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ بمبئی میں ایک سال رہنے کے بعد وہ مجھے دس ہزار گھر بیٹھے دیں گے ...."

اس امید میں وہ بمبئی چلے گئے اور دادر میں ایک مکان کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ وہاں سے ۱۔ جولائی ۱۹۳۴ء کو ایڈیٹر زمانہ کے نام ایک خط لکھا:-

"میں یکم جون کو بمبئی چلا آیا۔ اس کمپنی سے ایک معاہدہ کر لیا ہے۔ سال بھر میں چھ قصے اُسے دیتا ہوں گے۔ رسالوں سے متواتر نقصان ہو رہا تھا۔ بک سیلروں سے روپے وصول نہ ہوتے تھے۔ کاغذ وغیرہ کا بار بڑھتا جاتا تھا۔ مجبور ہو کر میں نے یہ معاہدہ کر لیا۔ چھ قصے لکھنا مشکل نہیں ہاں ڈائرکٹروں کے مشورے سے لکھنا ضروری ہے۔ کیا چیز فلم کے لئے موزوں ہوگی اس کا بہترین فیصلہ وہی کر سکتے ہیں ...."

پریم چند کو اس وقت کاغذ کے لئے لگ بھگ دو ہزار روپے کے قریب جمع کرنے تھے۔ بمبئی جانے سے پہلے جنیندر کمار جین کے نام ایک خط میں انھی مشکلات کا ذکر کیا تھا، لکھتے ہیں:-

"بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے، تنخواہ کی بات نہیں ٹھیکے کی بات ہے۔ آٹھ ہزار روپے سالانہ پر۔ اب میں اس حالت پر پہنچ گیا ہوں جب مجھے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول کو بازار میں بیچوں .... کمپنی والے حاضری کی قید نہیں رکھتے۔ میں جو چاہوں لکھوں، جہاں چاہے چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر رہنے کے بعد ایسا کنٹریکٹ کر لوں گا۔ یہیں (بنارس میں) بیٹھے بیٹھے میں چار کہانیاں لکھ دیا کروں گا، اور چار پانچ ہزار روپے مل جایا کریں گے۔

جن سے "جاگرن" اور "ہنس" دونوں مزے میں چلیں گے، اور پیسے کی تکلیف جاتی رہے گی"۔

ان دنوں بے کاری اور کساد بازاری خوب پھیل رہی تھی جس کی وجہ سے مزدوروں اور مل مالکوں میں ٹکر ہو رہی تھی۔ پریم چند وقت کے اس اہم مسئلے سے کیسے غافل رہ سکتے تھے اور مزدوروں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے فلم بڑا اچھا وسیلہ تھی چنانچہ پریم چند نے اپنی پہلی کہانی "مل مزدور" لکھی۔

لکھنے کے بعد یہ کہانی فلم کی شکل میں کیسے تیار ہوئی۔ اس کی بابت ایک صاحب للت کمار نے لکھا ہے جو پریم چند کی بدولت کمپنی کے ایکٹروں میں بھرتی ہو گئے اور لگ بھگ ہر روز اُن سے ملتے تھے۔ انھوں نے ایک مضمون "مل مزدور فلم کیسے بنی؟" میں لکھا ہے:-

"اس وقت وہ اپنی کہانی "مل مزدور" ختم کرنے میں مصروف تھے..... کہانی ختم کرتے ہی انھیں اس کا اردو ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ کیونکہ کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر، فلم ڈائرکٹر مسٹر بھوٹانی اور اُن کے ساتھی مسٹر خلیل آفتاب ہندی نہ جانتے تھے۔ پھر سینیریوں کی آسانی اور بھوٹانی صاحب کی رائے کے مطابق کہانی میں کئی تبدیلیاں کرنی پڑیں، کچھ نئی باتیں جوڑیں اور کچھ ہٹائی گئیں جو شکل پہلے تجویز کی گئی تھی، اس کے تمام حصے الگ کر دئے گئے اور قصے کو نئی شکل دی گئی۔ اس سے پلاٹ میں صرف تبدیلی ہی نہیں ہوئی بلکہ کئی جگہ اصل مطلب اور زبان کا لطف بھی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد شوٹنگ شروع ہوئی۔ تصویر تیار کی جانے لگی اور کئی جگہ پھر تبدیلیاں ہوئیں۔ خیر دن رات

محنت کر کے تین ساڑھے تین مہینے میں فلم تیار ہوئی...... اس فلم سے کمپنی کو بڑی بڑی امیدیں تھیں، کیونکہ اس میں ایک ایسے عام مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی تھی، جس میں دولت مندوں یعنی مل کے مالکوں اور مزدوروں کی کشمکش نمایاں تھی، پریم چند کی اس پرجوش تصویر نے اس مسئلے پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ مالکوں کا ظالمانہ رویہ، ان کی سختی، من مانا برتاؤ، مزدوروں کی خراب حالت، ان کی بہو بیٹیوں کی غیر محفوظ حالت اور اس کا نتیجہ۔ یہ سب باتیں بڑی صفائی اور قابلیت سے دکھائی گئی ہیں ....

اس فلم میں ایک پنچایت بھی ہے جس کے صدر پریم چند خود ہیں۔ اس پنچایت کا کام مل کے مالکوں اور مزدوروں میں سمجھوتہ کرانا ہے، یعنی اس فلم میں گاندھی واد کی سمجھوتہ بازی موجود ہے، جس کا مقصد طبقوں کی آویزش کو آمیزش میں ڈھالنا ہے جو مل کے مالکوں اور مزدوروں کو مل جل کر رہنے کا اپدیش کرتی ہے۔

لیکن گاندھی ازم کا یہ ہڑتال توڑ منتر قبول کرنے کے باوجود پریم چند کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مادی حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کرتے، وہ مزدور، کسانوں اور محنت کش طبقہ کی جدوجہد کی جڑ دل کو ہمیشہ ان کی اقتصادی مشکلات میں ڈھونڈتے ہیں اور اسے بالکل ٹھیک ڈھنگ سے ابھرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔

ان کی ایک کہانی "ڈامل کا قیدی" ہے جس میں گاندھی کے فلسفے کے

مطابق مل کے مالک سیٹھ کا صرف ہردے پریورتن یعنی ماہیت قلب ہی نہیں ہوتا بلکہ مسئلہ تناسخ کی بھول بھلیاں بھی موجود ہیں جن سے اصلی مسئلہ کافی الجھن میں پڑ جاتا ہے، پھر بھی طبقاتی جدوجہد پوری شدت سے ابھری ہے۔ پریم چند نے ایک طرف سیٹھ کی منافع خوری اور ریاکاری کی تصویرکشی کی ہے اور دوسری طرف مزدوروں کی تخفیف اجرت میں کمی اور اس کے نتیجے کے طور پر ہڑتال اور جدوجہد بڑی خوبی سے نمایاں کی ہے۔

کہانی کے چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں:۔

"سیٹھ جی تاجر ہیں، تاجر کا کام منافع حاصل کرنا ہے۔ جیسے بھی ملے۔"

"عام اہل ثروت اصحاب کی طرح سیٹھ جی نے بھی ایک مندر بنایا تھا۔ ٹھاکر جی کی پوجا کے لئے ایک پجاری نوکر رکھ لیا تھا اور روزانہ درشن کیا کرتے تھے رات کو دنیا کے دھندوں سے فارغ ہو کر۔"

"سیٹھ جی کا سودیشی مل ممتاز ملوں میں ہے۔ جب سے سودیشی تحریک شروع ہوئی ہے مال کی کھپت دونی ہو گئی ہے اور سیٹھ جی نے موقعہ دیکھ کر قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی آدمیوں کی مزدوری میں تخفیف کا اعلان کر دیا ہے۔ کیونکہ غلہ ارزاں ہو گیا ہے اور نصف مزدوری پر کثرت سے آدمی مل رہے ہیں۔ کاشتکار دیہاتوں سے بھاگ بھاگ کے بمبئی آ رہے ہیں۔ تخفیف کا اعلان محض پرانے آدمیوں کو برطرف کرنے کا حیلہ ہے۔"

پھر جب ہڑتال ہوتی ہے تو سیٹھ اور حکومت کی ملی بھگت ملاحظہ ہو:۔

"صبح کا وقت ہے مل کے احاطہ کے باہر مزدوروں کا ہجوم ہے پھاٹک پر کانسٹبلوں کا پہرا۔ مل میں پوری ہڑتال ہے۔ مزدوروں کے سرغنہ نے سیٹھ جی سے بہت کچھ آرزو منت کی مگر سیٹھ جی نہ دبے"

جب سیٹھ جی نہیں مانتے تو مزدوروں کا لیڈر گوپی جو خود ایک مزدور ہے اپنے مزدور ساتھیوں سے مخاطب ہوتا ہے:۔

"ہم مرمٹیں گے لیکن ہم خود جان دے کر دوسروں کے لئے راستہ صاف کر دیں گے، تاکہ دوسرے جیئیں۔ دوستو زندگی میں ایسے موقع بھی آتے ہیں، جب مرجانا ہی زندگی کی دلیل ہوتی ہے۔ نئے آدمیوں کی بھرتی شروع ہو گئی ہے۔ آج ہمیں عہد کرنا پڑے گا کہ ہم کسی باہر کے آدمی کو مل اندر نہ گھسنے دیں گے۔ چاہے ہمارے اوپر لاٹھیاں چلیں، گولیاں برسیں۔ بھائیو......"

لڑائی بھی ہوتی ہے، خون بھی بہتا ہے اور کہانی اس طرح آگے چلتی ہے۔ فلم کی کہانی بھی اسی طرح آگے چلی ہوگی۔ کنٹرہیونت کے باوجود کمپنی کو امید تھی کہ فلم مقبول ہوگی، لیکن سینسر کی قینچی نے امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس بے رحمی سے کانٹ چھانٹ کی کہ فلم کی دھجیاں اڑا دیا، کتنے ہی موثر سین کاٹ دیئے اور کئی مختصر کر دئے، فلم کا اصل مقصد زائل اور چہرہ مسخ ہو گیا۔

کمپنی کو از سر نو محنت کر کے کتنی ہی تصویریں دوبارہ لینی پڑیں پھر بھی سنسر کی تسلی نہ ہوئی۔ حکومتِ بمبئی نے اس کی نمائش بند کر دی البتہ پنجاب میں چونکہ وہاں مل اور مزدور نہیں تھے، یہ فلم کچھ دنوں دکھائی گئی۔ مگر بمبئی گورنمنٹ کی پیروی میں پنجاب حکومت نے بھی اسے جلد بند کر دیا پھر مسٹر بھوٹانی نے ڈیڑھ سال کی کوششوں کے بعد "غریب مزدور" کے نام سے اُسے دکھانے کی اجازت حاصل کی، کیونکہ غریب مزدور تو سرمایہ دار دیکھ سکتا ہے۔ اس پر رحم کھا سکتا ہے لیکن لڑاکا مزدور دیکھنا اُسے پسند نہیں، خوف آتا ہے۔

اس بات نے پریم چند کو دل برداشتہ کر دیا وہ جو ارمان لے کر بمبئی آئے تھے پورا نہ ہوا، انھوں نے ایک اور فلم "نوجیون" یا "شیر دل عورت" لکھی ڈائرکٹروں کے رویے نے انھیں فلم سے بالکل بدظن کر دیا۔ انھوں نے ایک دن شورانی سے کہا "یہاں جو کچھ ہے سینما کے مالک لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، لیکھک کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ وہ تو ہمیشہ کمانا چاہتے ہیں۔"

ابھی سال بھر بھی بمبئی آئے نہیں ہوا تھا کہ ۳۰ اپریل ۱۹۳۵ء کو جینندر کمار کے نام لکھا:۔

"میں جن ارادوں سے یہاں آیا تھا ان میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ پروڈیوسر جس طرح کی کہانیاں بناتے رہے ہیں اس سے جو بھر نہیں ہٹ سکتے۔ رکیک مذاق کو یہ لوگ تماشے کی جان سمجھتے ہیں۔

ان کا عقیدہ انوکھا ہے۔ راجہ رانی وزیروں کی سازشیں۔ نقلی لڑائیاں بوسہ بازی یہی ان کے مقصد ہیں، میں نے سماجی کہانیاں لکھی ہیں جنھیں تعلیم یافتہ طبقہ بھی دیکھنا چاہتا ہے لیکن ان کو فلم کرتے وقت شبہ ہوتا ہے کہ چلیں یا نہ چلیں، یہ سال تو پورا کرنا ہی ہے۔ قرض دار ہو گیا تھا، قرض پٹ جائے گا۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ناول" گئودان" کے آخری صفحات لکھنے کو باقی ہیں۔ ادھر طبیعت ہی نہیں جاتی۔ اپنے پرانے اڈے پر جا بیٹھوں، وہاں دولت نہیں ہے۔ مگر سکونِ قلب ضرور ہے یہاں تو معلوم ہوتا ہے۔ زندگی برباد کر رہا ہوں۔"

ضیاء الدین برنی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:۔ " بمبئی میں مجھے ہم مذاق آدمی نہیں ملتا۔ اس لئے آپ سے ملنے کا مجھے کتنا شوق ہوتا ہے، وہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔"

بمبئی آنے سے پہلے مہالکشمی سینے ٹون کو" بازارِ حسن" فلمانے کی اجازت دیدی تھی۔ اس اثنا میں وہ بھی فلم بن کر سامنے آیا تو بہت کوفت ہوئی للت کمار لکھتے ہیں:۔ یہ فلم پہلے پہل بمبئی کے امپیریل سنیما ہاؤس میں چلائی گئی تو میں موجود تھا۔ بڑی ناامیدی ہوئی۔ پریم چند سے ملاقات ہونے پر میں نے اس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا: بھائی مجھ سے کتاب کا کاپی رائٹ مانگا گیا، میں نے اُسے دیدیا۔ اب اگر فلم بنانے والے اسے اچھی طرح نہ بنا سکیں تو میرا کیا قصور؟"

بمبئی میں اُن کی صحت بھی اچھی نہ رہتی تھی اور اجنتا سینے ٹون

کی مالی حالت خراب ہو گئی تھی اس لئے انھوں نے سال بھر پورا ہونے سے پہلے ہی بمبئی میں رہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

بمبئی ٹاکیز کے ڈائرکٹر مسٹر ہمنسو رائے نے چاہا کہ وہ ان کی کمپنی سے وابستہ ہو جائیں۔ لیکن پریم چند نے خراب آب و ہوا کا عذر کیا اور کہا کہ بس اب میں بنارس جا کر رہنا چاہتا ہوں۔ جب اُن سے کہا گیا کہ بنارس ہی سے افسانے بھیج دیا کریں انھوں نے معذوری کا اظہار کیا اور اپنی جگہ دوسرے آدمی کی سفارش کر دی۔

وہ فلم لائن سے بے دل ہو چکے تھے۔ اب خود فریبی کی گنجائش نہیں تھی۔

صدارت

"ہماری انجمن ادب کو سعی اور عمل کا
پیغام اور ترانہ بنانے کی مدعی ہے۔" (پریم چند)

یہ الفاظ پریم چند نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بابت کہے تھے
جس کا پہلا اجلاس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوا تھا اور جس کے وہ صدر
منتخب ہوئے تھے انھوں نے جس والہانہ انداز سے خطبہ صدارت شروع
کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس اجلاس پر انھیں کتنا فخر تھا، اور انجمن سے
انھیں کیا کیا اُمیدیں وابستہ تھیں۔ لکھتے ہیں:۔

"حضرات یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے ہمارے
سمیلنوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت
سے بحث کی جاتی رہی ہے، یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود

ہے اس کا منشا رخیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا، وہ بھی نہایت ہی اہم کام ہے۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت اختیار نہ کرے اس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے کی طاقت کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کرکے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لئے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو ہماری احسان فراموشی ہوگی، لیکن زبان ذریعہ ہے منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کر لی ہے کہ ہم زبان سے گذر کر اس کے معنی کی طرف متوجہ ہوں۔ اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہو۔ وہی زبان جس میں ابتداً باغ و بہار اور بیتال پچیسی کی تصنیف ہی معراج کمال تھی۔ اور اب اس قابل ہو گئی ہے کہ علم و حکمت کے مسائل بھی ادا کرے۔"

غالباً ۱۹۲۳ء کی بات ہے کہ پریم چند اور دیا نارائن نگم بہت دنوں سے ہندوستانی اکیڈمی کھلوانے کی فکر میں تھے، آخر ہندوستانی اکیڈمی کھلی تو پریم چند اس کے سرگرم کارکن تھے۔ اس کی میٹنگوں سے لوٹنے کے بعد شورانی دیوی اُن سے اکثر اکیڈمی کی بابت پوچھا کرتیں پریم چند نے جواب دیا

جس قسم کی انجمن ہم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ تو نہیں ہوئی۔

شورانی :- تب ان لوگوں نے یہ کیا کھولا ہے۔

پریم چند :- کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔

شورانی:۔ تو آپ لوگ مطمئن کیوں نہیں ؟

پریم چند:۔ یہ کام کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے ۔ ہم تو چاہتے تھے کہ ہندوستان کی ہر زبان کا ایک ایک لیکھک ہو ۔ اس کمیٹی میں جس کسی موضوع پر کوئی کتاب نکلتی اسے پہلے لیکھکوں کی یہ کمیٹی دیکھ لیتی، اس طرح کوئی بھاری کتاب نہ نکل سکتی ۔ اس سے ان ادیبوں کے اوصاف کے ارتقاء کو نقصان نہ پہنچتا ۔ اپنے یہاں ادب کی ترقی بھی ہوتی اور ساتھ ساتھ ان ادیبوں کا ارتقا بھی ہوتا ، جس چیز کی کمی ہوتی ، اس کا اضافہ کیا جاتا ۔ لیکھکوں کو ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت نہ ہوتی ۔ نئے لیکھکوں کے گن دوش کوئی بتاتا نہیں ، بس "نہیں ٹھیک ہے" کہہ کر لوٹا دیا جاتا ہے ۔ یہ بنائے تھوڑی ہے نئے ادیبوں کے متعلق دانش وروں کا فرض یہ ہے کہ وہ ان کے گن دوش سمجھا دیں ۔ اس ڈھنگ سے اکیڈمی اپنا کام کرتی ۔ رہا معاوضے کا سوال ۔ رائلٹی پر بھی لے سکتی تھی ، یک مشت دے کر بھی لے سکتی تھی ۔

شورانی:۔ لیکھکوں کی رچنائیں (تخلیقات) کہیں پڑی تھوڑی ہی رہتی ہیں ۔ ؟

پریم چند:۔ ایسے پبلشروں کی ضرورت نہیں ہے جو اپنا ہی پیٹ بھریں ۔ ادیبوں کو بھی کچھ ملنا چاہیئے ۔

....

.... اکیڈمی اور ادیبوں کا تو کینبے کا سا رشتہ

ہو جانا چاہیئے۔ جب تک دونوں میں ایسا رشتہ نہیں ہوگا کچھ بھی نہیں ہونے کا۔ اس طرح جب لیکھک کو کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا تو وہ مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، جس سے ادیبوں کا ارتقا نہیں ہوتا اور ادب کی ترقی رک جاتی ہے۔

شورانی:- ادب کی ترقی اور کیسے ہو؟

پریم چند:- ابھی "ترقی" کا تو نام تک نہیں، بلکہ کہنا تو یہ چاہیئے کہ کام سے زیادہ آپس میں "تو، تو" "میں میں" ہے۔ "تو تو" "میں میں" میں کہیں کام ہوتا ہے؟"

شورانی:- تب کام کیسے ہوگا؟

پریم چند:- جب تک یہاں کا ادب ترقی نہیں کرے گا، تب تک ادب، سماج اور سیاست سب کے سب جوں کے توں پڑے رہیں گے۔

شورانی:- تو کیا آپ ان تینوں کی ایک مالا سی پرونا چاہتے ہیں؟

پریم چند:- اور کیا یہ چیزیں مالا جیسی ہی ہیں۔ جس زبان کا ادب اچھا ہوگا، اس کا سماج بھی اچھا ہوگا۔ سماج کے اچھا ہونے پر مجبوراً سیاست بھی اچھی ہوگی۔ یہ تینوں ساتھ ساتھ چلنے والی چیزیں ہیں۔

شورانی:- تو کیا ضروری ہے کہ تینوں کو ساتھ لے کر ہی چلا جائے۔

پریم چند:- ان تینوں کا مقصد ہی جب ایک ہے ادب، اور سماج اور سیاست کا رشتہ بالکل اٹوٹ ہے۔ سماج آدمیوں کے

گروہ ہی کو تو کہتے ہیں۔ سماج میں جو نفع نقصان اور سکھ دکھ ہوتا ہے وہ آدمیوں ہی پر ہوتا ہے نا۔ سیاست میں جو سکھ دکھ ہوتا ہے، وہ بھی آدمیوں پر پڑتا ہے۔ ادب سے لوگوں کا ارتقا ہوتا ہے ادب سے آدمی کے خیالات اچھے یا بُرے بنتے ہیں۔ انھی خیالات کو لے کر آدمی جیتا ہے، اور ان سب تینوں چیزوں کی پیداوار کا باعث آدمی ہے۔

شورانی۔ آپ شاید جڑ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پریم چند: جڑ ہی کی حفاظت میں تو سب ممکن ہے بنا جڑ کے تحفظ کے کچھ نہیں ہوتا۔

شورانی:۔ ان لوگوں کے دماغ میں یہ باتیں کیوں نہیں آتیں۔

پریم چند:۔ بڑے آدمیوں کے دماغ میں کیوں آئیں؟ غریبوں کے مسائل کی طرف ان کا دھیان ہی کب جاتا ہے؟ جب تک ان پر نہیں بیتے گی، تب تک کیسے سمجھ سکیں گے، ان سبھوں کو سدھارنے کے لئے ادب ہی ایک ذریعہ ہے۔ جب تک کوئی اسے اپنے ہاتھ میں نہیں لے گا، تب تک نہیں سُدھر سکتا۔"

اُنھوں نے ہندی کے کچھ ادیبوں کو ساتھ ملا کر ایک "لیکھک سنگھ" بھی کھولا تھا، اور ہندی پریشد کر اس امید میں "ہنس" دے دیا تھا کہ وہ ادیبوں کی ترقی اور ارتقار کے لئے مفید ثابت ہوگی لیکن اس پر تو خالصتاً سیٹھوں کا قبضہ تھا، اس لئے کیا ہوتا؟

پریم چند نے ہمیشہ سنہرے اور بلند خواب دیکھے تھے اور ان ہی
خوابوں کو حقیقی شکل دینے کے لئے وہ جد و جہد کرتے رہے تھے ۔ پہلے وہ
سپنے اپنی ذات تک محدود تھے وہ اچھی تعلیم حاصل کرکے اچھا اور باعزت
مقام حاصل کرنا چاہتے تھے ، لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے محسوس کیا کہ ایک
آدمی کے ترقی کرنے سے کیا بنتا ہے ۔ اگر سارا سماج سکھی ہو ، سب کو سکھ
کے ذرائع حاصل ہوں تبھی دراصل ایک آدمی بھی سکھی رہ سکتا ہے ،
ورنہ یہ سکھ بے کار ہے ، یوں ان کی انفرادیت سارے سماج کی نمائندہ
بن گئی ۔ اور وہ بہتر سماج اور بہتر زندگی اور انسان کے بہتر مستقبل کے
سپنے دیکھنے لگے ۔

جنگ جہاں تباہی اور بربادی لاتی ہے اور اس سے اقتصادی
سنکٹ بڑھتا ہے ، وہاں اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ طبقاتی
کش مکش ابھر کر سامنے آ جاتی ہے ۔ پرانے تصورات ٹوٹتے ہیں اور انسانی
شعور تیزی سے سوچنے لگتا ہے ۔ اب چونکہ پریم چند کی انفرادیت
سماج کی نمائندگی کرتی تھی ، اس لئے پہلی عالمگیر جنگ میں ہمارے سماج
میں جو مسائل پیدا ہوئے اس میں جو ذہنی اور طبقاتی کش مکش بڑھی
وہ ساری کش مکش ہمیں "گوشۂ عافیت" میں نظر آتی ہے ۔

شروع میں لکھن پور ہندوستان کے عام دیہاتوں کی طرح
تباہ حال گاؤں ہے جسے غیر ملکی حکومت کے افسر اور پیادے ، زمیندار
اور اس کے گماشتے اور ساہوکار سب مل کر لوٹتے ہیں لیکن ناول

کے آخر میں مایا شنکر اپنے زمینداری حقوق سے دست بردار ہوجاتا ہے اور زمینداری ختم ہوتے ہی لکھن پور کی کایا پلٹ ہوجاتی ہے۔ لوٹ کھسوٹ سے نجات پاکر کسان کی دولت اس کی خوش حالی میں اضافہ کرتی ہے۔ خود پریم چند کے الفاظ میں لکھن پور کی تصویر ملاحظہ ہو:-

"مایا شنکر اپنے دورے پر ہیں۔ اسی سلسلے میں لکھن پور بھی گئے ہیں، دیکھتے ہیں کہ جو لکھن پور جو تباہی اور بربادی کا مسکن تھا اب بہار آفریں اور بہشت زار بن گیا ہے، وہاں خوب رونق اور صفائی ہے سبھی گھروں کے دروازوں پر سائبان لگے ہوئے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے تخت بچھے ہیں۔ اکثر گھروں میں سفیدی ہوگئی ہے۔ پھونس کے جھونپڑے مفقود ہیں۔ سبھی گھروں پر کھپریل ہیں۔ دروازوں پر بیلوں کے لئے پکی چرنیاں بنی ہوئی ہیں۔ ایک دو کے دروازے پر گھوڑے بندھے نظر آتے ہیں۔ پرانے چوپال میں اسکول ہے اور اس کے سامنے ایک پکا کنواں ہے اور دھرم شالہ ہے ...."

اس کے علاوہ لوگوں کے پاس بیل گھوڑے ہیں۔ گھروں میں اناج ہے۔ بلراج تو ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر بن گیا ہے، جہاں پہلے کوئی اخبار کا نام بھی نہیں جانتا تھا وہاں اب اچھی خاصی لائبریری ہے، اور لوگوں کا اخلاق بھی سدھر گیا ہے۔"

ادیب ایک خوب صورت دنیا کا خیالی تصور اس لئے پیش کرتا ہے کہ اگر لوگ دماغی طور پر حسین دنیا اور بہتر زندگی کے خواب دیکھنے

لگیں گے تو وہ اسے لانے کے لئے واقعی جدو جہد کریں گے۔ یعنی ادب خستہ حال زندگی سے بہتر زندگی کی طرف بڑھنے کے لئے راہ ہموار کرتا ہے۔

پریم چند نے ٹھیک ایسا ہی کیا تھا اور جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اسے لانے کے لئے واقعی جدو جہد کر رہے ہیں تو وہ بھی ملازمت سے مستعفی ہو کر اس جدو جہد میں شریک ہو گئے۔

گاندھی کی قیادت انھوں نے اس لئے قبول کی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے غلامی کے بندھن ٹوٹیں گے۔ زمینداری ختم ہوگی اور ملک میں خوشحالی آئے گی۔

وہ سمجھوتہ پرستی کو کبھی پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے لبرل پارٹی کے ہمیشہ خلاف رہے اور گاندھی سے پہلے تلک کے مداح تھے۔ منشی دیا نارائن نگم رقم طراز ہیں: "پریم چند کا میلان طبع گرم دل کی طرف تھا۔ احمدآباد کانگریس دیکھنے ہم لوگ ساتھ ساتھ گئے اور ایک ہی جگہ ٹھیرے لیکن وہ مسٹر تلک کے طرفدار تھے اور میں مسٹر گوکھلے اور سر فیروز شاہ کا حامی تھا۔ ہر وقت بحث رہتی تھی۔ مگر دونوں اپنی جگہ قائم رہے۔"

جزوی اصلاحات کو وہ ناکافی سمجھتے تھے اور مارلی اور مانٹیگو چیمسفورڈ کی اسکیم سے مطمئن نہ تھے۔

آئینی اصلاحات کے متعلق ان کا نظریہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء کے خط سے واضح ہو جاتا ہے لکھتے ہیں:۔

"میں ریفارم اسکیم یا ایکٹ کے متعلق مسٹر چنتامنی وغیرہم سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں معتدل پارٹی اس وقت ضرورت سے زیادہ مغرور اور نازاں ہے۔ حالانکہ اصلاحوں میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ تعلیم یافتہ جماعت کو کچھ اسامیاں زیادہ مل جائیں گی اور جس طرح یہ جماعت وکیل بن کر رعایا کا خون پی رہی ہے اسی طرح آئندہ یہ حاکم بن کر رعایا کا گلا کاٹے گی۔ اس کے سوائے اور کوئی جدید اختیار نہیں دیا گیا ہے، جو اختیارات دئے گئے ہیں ان میں بھی اتنی شرطیں لگا دی ہیں کہ ان کا دینا نہ دینا برابر ہو گیا ...."

نگم صاحب آگے لکھتے ہیں: "پریم چند نا برابر کی لڑائی میں سمجھوتے کے خیال سے مشتبہ رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کڑی جدوجہد کے بغیر کچھ حاصل نہ ہوگا اور وہ اس کے لئے عوام کو جلد سے جلد تیار کرنے کی طرف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت سے سخت ٹکر لئے بغیر کام نہ چلے گا۔ اور وہ اس کے لئے نقصانات برداشت کرنے کے لئے بھی تیار تھے۔ انگریز حکام سے انھیں عام طور سے بدظنی تھی اور بالآخر وہ سرکاری ملازمت ترک کرکے باضابطہ نان کوآپریٹر ہو گئے۔ ایک خط کا جس میں مہاتماجی کی تحریک نمک کو قبل از وقت کہا گیا تھا وہ نہایت گرم جوشی سے جواب دیتے ہیں:۔

"جس طرح موت ہمیشہ قبل از وقت ہوتی ہے۔ ساہوکار کا تقاضا ہمیشہ قبل از وقت ہوتا ہے، اسی طرح ایسے سارے کام جن میں ہمیں

مالی یا وقتی نقصان کا اندیشہ ہو قبل از وقت معلوم ہوتے ہیں۔ اس تحریک کی قبولیت ہی بتا رہی ہے کہ وہ قبل از وقت نہیں ہے"
تحریک واقعی قبل از وقت نہیں تھی۔ ملک واقعی لڑنے کے لئے تیار تھا، لیکن جیسے ہی تحریک شہروں سے نکل کر گاؤں میں پھیلنے لگی اور کسانوں نے لگان کی عدم ادائیگی کی مہم شروع کی۔ گاندھی نے سوئچ آف کر دیا۔ گاندھی ارون پیکٹ ہوا۔ آزادی تو کیا ملنی تھی گاندھی نے جن گیارہ نکات کا اعلان کر کے ڈانڈی مارچ شروع کیا تھا، ان میں سے بھی ایک نہیں مانا گیا۔
اس سمجھوتہ بازی سے پریم چند کو جو رنج پہنچا۔ اُسے اُنھوں نے "گئودان" میں ایک فقرے میں بیان کر دیا ہے۔ "دل پر جتنا گہرا صدمہ ہوتا ہے وہ اپنے ردّ عمل میں اتنا ہی موثر ہوتا ہے"
پریم چند جس لکھن پور گاؤں کو جنت نظیر اور جس کسان کو خوش حال دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ ہوری کے گاؤں بیلاری کا نقشہ ملاحظہ ہو۔
"گوبر نے گھر پہنچ کر اس کی حالت دیکھی تو ایسی مایوسی ہوئی کہ اسی وقت وہاں سے لوٹ جائے۔ گھر کا ایک حصہ تو تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی گرا، ابھی گرا، دروازے پر ایک بیل بندھا ہوا تھا، وہ بھی نیم جان"
اور یہ حالت صرف ہوری کی ہی نہ تھی۔ سارے گاؤں پر یہی

مصیبت نازل تھی، ایسا ایک آدمی بھی نہ تھا جس کی رونی صورت نہ ہو، گویا اُن کی روح پر غم کا سکہ بیٹھا ہوا۔ انھیں کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہا ہے۔ دروازے پر منوں کوڑا جمع ہے۔ بدبو اُڑ رہی ہے، لیکن ان کی ناک میں نہ سونگھنے کی حس باقی ہے، نہ آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت سرِ شام ہی سے دروازوں پر گیدڑ رونے لگتے ہیں۔ لیکن انھیں کوئی غم نہیں۔"

اِدھر ان کی یہ حالت ہے۔ اُدھر انھیں لوٹنے والے بیلاری کے دیس بھگت زمیندار کی ریاکاری ملاحظہ ہو:۔

"پچھلی ستیاگرہ کی لڑائی میں رائے صاحب نے بڑا نام کمایا تھا کونسل کی ممبری چھوڑ کر جیل گئے تھے۔ جبھی سے اُن کے علاقے کی اسامیوں کو اُن سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی۔ یہ نہیں کہ ان کے علاقے میں اسامیوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت کی جاتی ہو یا تاوان بیگار کی سختی کم ہو۔ مگر یہ ساری بدنامی مختاروں کے سر تھی۔ رائے صاحب کی نیک نامی میں کوئی بٹہ نہ لگ سکتا تھا، وہ بے چارے بھی تو اسی ضابطے کے غلام تھے۔"

اس سمجھوتہ بازی سے بہت سے لوگوں کا بھرم ٹوٹا تھا، خاص طور پر ان نوجوانوں کا جو نہایت جوش اور خلوص کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہوئے تھے۔ گاندھی ازم اور اہنسا سے ان کا اعتماد اٹھ گیا۔ پریم چند اپنی ایک کہانی "بھاڑے کے ٹٹو" میں لکھتے ہیں:۔

"رمیش جیل سے نکل کر پکا انقلاب پسند بن گیا ہے۔ جیل کی تاریک کوٹھریوں میں تمام دن کی سخت محنت کے بعد وہ غریبوں کی فلاح اور اصلاح کے منصوبے باندھا کرتا تھا، سوچتا کہ انسان کیوں گناہ کرتا ہے، اس لئے نا کہ دنیا میں اس قدر افتراق ہے ا کوئی تو عالی شان محلوں میں رہتا ہے اور کسی کو درخت کا سایہ بھی میسر نہیں، کوئی ریشم و جواہرات سے منڈھا ہوا ہے کسی کو پھٹا کپڑا بھی نصیب نہیں ہے۔ ایسی بے انصافی دنیا میں اگر چوری، ہتیا اور ادھرم ہے تو یہ کس کا قصور ہے، وہ ایک ایسی انجمن قائم کرنے کے خواب دیکھتا تھا جس کا کام دنیا سے اس افتراق کو ناپید کر دینا ہو۔ دنیا سب کے لئے ہے اور اس میں سب کو راحت و آرام سے بسر کرنے کا مساوی حق ہے۔ نہ ڈاکہ ڈاکہ ہے، نہ چوری! چوری! دولت مند اگر اپنی دولت خوشی سے نہیں بانٹ دیتا تو اس کی مرضی کے خلاف تقسیم کر لینے میں کیا گناہ ہے؟ دولت مند اُسے گناہ کہتا ہے تو کہے، اس کا بنایا ہوا قانون اگر سزا دینا چاہتا ہے تو دے۔ ہماری عدالت بھی علیحدہ ہوگی۔ اس کے سامنے وہ سبھی ملزم ہوں گے۔ جن کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت ہے .... جیل سے نکلتے ہی اس نے اس جماعتی انقلاب کا اعلان کر دیا۔ خفیہ انجمن قائم ہونے لگی ہتھیار جمع کئے جانے لگے"

واقعی ملک میں طبقاتی جدوجہد تیز ہو گئی تھی۔ اشتراکی خیالات

کے نوجوانوں نے مزدوروں اور کسانوں کو منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین انھی نئے حالات سے پیدا ہوئی تھی۔ اس کی داغ بیل ڈالنے والے وہ ترقی پسند اور انسان دوست ادیب تھے جو سیاست کی اس نئی ترقی پسند تحریک کے ہم نوا تھے جس کا مدعا دولت اور محنت کے افتراق کو اور لوٹ کھسوٹ کو ختم کر کے مساوات کا نظام قائم کرنا تھا۔ انجمن کے اعلان نامہ میں کہا گیا تھا :-

"ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پستی اور رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی نت نئے روپ بدل کر مہلک زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبہ میں سرائت کرتا جا رہا ہے۔

اس لئے ہندوستانی مصنفوں کا فرض ہے کہ ملک میں جو نئے ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشو و نما میں پورا حصہ لیں۔"

اس اعلان نامے کو مرتب کرنے میں پریم چند کا بڑا ہاتھ تھا اور انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں "ادب کی غرض و غائت" بیان کرتے ہوئے کہا تھا :-

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی

حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سُلائے نہیں، کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"

یقیناً یہ الفاظ ایک فردِ واحد نے نہیں سماج کے پورے شعور نے ادا کئے تھے، جس طرح اس تقریر سے پریم چند کے شعور کی پختگی اور سنجیدگی ظاہر ہے، اسی طرح وہ رسمی صدر نہیں تھے، انھیں ان کا ارتقا ہی کرسیٔ صدارت پر لایا تھا۔ ہم ایک ایسے شخص کو کرسیٔ صدارت پر متمکن دیکھتے ہیں جس کی آنکھوں میں سنجیدہ اور آہنی عزم تھا جسے واقعی مظلوم انسانیت کی نمائندگی کا حق پہنچتا تھا۔

عمل

جینے کا حاصل عمل کے سوا اور کیا

ہے۔ (پریم چند)

پریم چند نے اپنی بچوں کی رامائن " رام چرچا" میں لکھا ہے کہ جب رام اور لچھمن راکششوں سے جنگ کرنے کے لئے وشوامتر کے ساتھ چلے تو راستہ میں وشوامتر نے انھیں ایک ایسا منتر سکھایا جس کو پڑھنے سے تھکاوٹ بالکل نہیں آتی تھی۔

منتر یہ تھا کہ انھوں نے ظالم اور ظلم کے خلاف لڑنے کی ضرورت کو سمجھ لیا تھا اور وہ پورے شعور کے ساتھ جبر و تشدد کو ختم کرنے پر کمربستہ ہو گئے تھے۔ جب آدمی ظلم کے خلاف باشعور جد و جہد کرتا ہے تو اسے کام

سے بے انتہا مسرت حاصل ہوتی ہے، اور تھکاوٹ واقعی پاس نہیں آتی
باعمل آدمی جانے ان جانے ارتقار کی منزلیں طے کرتا ہے آگے بڑھتا
ہے ــــــ جب عمل کے ساتھ شعور بھی مل جاتا ہے، تو
منزلیں طے کرنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ آدمی ہر لمحہ اپنے ارتقار کو
ماپ سکتا ہے، دیکھ سکتا ہے اور وہ اسی نسبت سے اپنی جدوجہد
کو تند اور شدید بنا دیتا ہے۔

پریم چند میں اب یہ شدت پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے بڑی تیزی
اور سرعت سے بہت سی منزلیں طے کر لی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب ان
کی اصلاح پسندی انقلاب میں تبدیل ہو چکی تھی۔ انھیں اب تالیف
قلب، عدم تشدد اور اونچے طبقے کے لوگوں کی قیادت میں کوئی
بھروسہ نہیں رہ گیا تھا۔ انھیں وار اور نادار کے دو طبقے صاف
نظر آرہے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ لڑکر ہی اس بے انصافی اور
دولت کی غلط تقسیم کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے نئے ناول "منگل سوتر"
میں اس نئے احساس اور نئے شعور کی شارت صاف دکھائی دیتی
ہے۔ لکھتے ہیں :-

"......... دیوتا ہمیشہ رہے ہیں اور رہیں گے۔ انھیں
سنسار اب بھی دھرم اور نیتی پر چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اور وہ
اپنی زندگی کی قربانی دے کر وداع ہو جاتے ہیں۔ لیکن انھیں دیوتا
کیوں کہو؟ ــــــ بزدل کہو، خود غرض کہو، خود پسند کہو

دیوتا وہ ہے جو نیائے کی حفاظت کرے اور اس کے لیے پران دیدے اگر وہ جان کر انجان بنتا ہے تو دھرم سے گرتا ہے۔ اگر اس کی آنکھوں میں یہ نظام کھٹکتا ہی نہیں تو وہ اندھا بھی ہے اور بے وقوف بھی ——— دیوتا کسی صورت نہیں۔

درندوں سے لڑنے کے لئے ان کے بیچ میں ہتھیار باندھنا پڑے گا۔ ان کے پنجوں کا شکار بننا دیوتا پن نہیں جان پڑتا ہے۔"

(ہنس، اکتوبر ۱۹۳۵ء)

انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس نے ادب کے ذریعے سیاست کی ترقی پسند تحریک کی ——— آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کا جو اعلان کیا تھا پریم چند اسے عملی صورت دے رہے تھے اور اسی مقصد کے لئے "منگل سوتر" لکھنا شروع کیا تھا، لیکن افسوس کہ کانفرنس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد وہ سخت بیمار پڑ گئے اور انھیں یہ ناول مکمل کرنے کی مہلت نہیں ملی۔

۲۵؍جون کو رات کے ڈھائی بجے کے قریب یکایک ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ معدے کی بیماری انھیں مدت سے تھی اس سے کبھی افاقہ نہیں ہوا۔ ذراسی بد پرہیزی کی اور بیمار پڑ گئے۔ لیکن اس مرتبہ انھیں خون کی قے آئی اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ شورانی اُن کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئیں، لیکن ڈاکٹر نے تسلی دی کہ بلغم کی خرابی ہے، جلد آرام ہو جائے گا۔

لیکن یہ سب پیٹ کی خرابی تھی۔ اس دن چارپائی سے ایسا لگے کہ پھر چھوڑنے کی نوبت نہیں آئی۔ طبیعت بے چین رہتی تھی اور راتوں کو نیند کم آتی تھی۔ لیکن وہ اس حالت میں بھی کام کئے جاتے تھے رات کو روشنی میں پڑھتے لکھتے تھے۔ اسی حالت میں "منگل سوتر" کے بیسیوں صفحات لکھ ڈالے۔ اب ان کی تخلیقات میں اپنی ذات اور درمیانہ طبقہ کم آتا تھا۔ اب انھوں نے اپنی انفرادیت کو اپنی ہستی کو وسیع انسانیت کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا تھا۔ ان کے تصور میں وسعت تھی، اور انھیں نچلے طبقہ کی وکالت کرنا تھی۔ اس لئے گھیسو، مادھو، ہوری، دھنیا اور تلیا ان کی کہانیوں کے اہم کردار تھے۔ "کفن" کہانی انھیں دنوں کی پیداوار ہے جس میں انھوں نے بتایا کہ لوٹ کھسوٹ کس طرح آدمی کی قوتِ کار کو سلب کر لیتی ہے

شورانی انھیں اس بیماری کی حالت میں کام کرنے سے منع کرتی تھیں، لیکن پھر جلد ہی محسوس ہو گیا کہ ان کے نزدیک عمل ہی تو زندگی ہے۔ پھر منع کیا کرتیں!

جولائی میں وہ علاج کرانے لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں کئی ڈاکٹر واقف تھے۔ انھوں نے بڑی ہمدردی سے معائنہ کیا اور مرض کی نوعیت اور اہمیت ذہن نشین کرائی۔ لیکن علاج سے فائدہ کچھ نہیں ہوا۔ اس لئے پھر بنارس لوٹ آئے حالت پہلے سے بھی خراب ہو گئی تھی۔

اس حالت میں بھی لکھنا پڑھنا اور دوستوں سے خط و کتابت کرنا بدستور جاری رہا۔ بیماری بڑھ رہی تھی۔ موت قریب آ رہی تھی لیکن انھوں نے ذہنی طور پر موت کو شکست دے رکھی تھی۔ معدہ کا مرض پرانا تھا بیس بائیس سال سے موت کے ساتھ کش مکش کرتے آئے تھے۔ جون ۱۹۱۵ء میں ایڈیٹر زمانہ کے نام ایک کارڈ میں لکھا تھا

"میرے لئے بڑھاپے کا ذکر فضول ہے۔ میں کسی بوڑھے سے کم ہوں"

اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں گورکھپور سے ایک خط میں لکھا تھا:۔

"آپ کیا کہتے ہیں زندگی کی اُمید یہاں بھی کم ہے۔ مگر چاہتا ہوں کہ یا تو ساتھ چلیں یا خفیف تقدیم و تاخیر ہو۔ میں آپ کا پیش رو بننا چاہتا ہوں۔ مگر موت کی ٹھکر مارے ڈالتی ہے کتنا چاہتا ہوں، پرماتما پر بھروسہ رکھوں، مگر دل موذی ہے سمجھتا نہیں۔ کسی مہاتما کی صحبت ملے تو شاید راستے پر آئے۔ یہی فکر ہے کہ آج مر جاؤں تو ان بچوں کا کون پرسانِ حال ہوگا۔ گھر میں کوئی ایسا نہیں ہے .... دوستوں میں اگر ہیں تو آپ اور اگر نہیں ہیں تو آپ اور نہ ہوگا تو میرے بعد سال دو سال ان کی خبر تو لے سکتے ہیں"

اتنے عرصے سے وہ موت کو کامیابی کے ساتھ دھتہ بتاتے آئے تھے اور اب تو انھیں یہ اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ موت آ بھی جائے تو کیا فکر ہے۔ کچھ نہ کچھ کام تو کر لیا ہے۔ زندگی بے کار نہیں کھوئی

کام سے اُن کے دل میں جو یقین اور بھروسہ پیدا ہو گیا تھا اس کا اعلان انھوں نے "ادیب کا فرض" افسانہ میں یوں کیا ہے :۔

"ہمارا فرض ہے کام کرنا۔ ہم کام کرتے ہیں اگر اس پر بھی فاقہ کرنا پڑے تو میرا قصور نہیں۔ مر ہی تو جاؤں گا۔ ہمارے جیسے لاکھوں آدمی ہر روز مرتے ہیں ...... موت ڈرنے کی چیز نہیں ، میں اس سے نہیں ڈرتا"!

اس ضمن میں اُن کا ایک خط قابلِ ذکر ہے ، پنڈت بنارسی داس چترویدی نے ایک مرتبہ اُن کی خانہ نشینی کی شکایت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انھیں جوانی اور زندہ دلی قائم رکھنے کے لئے سیر و سفر کرنا چاہیے پریم چند نے انھیں جواب دیا تھا :۔

"نوجوانی اور زندہ دلی کا تعلق مزاج سے ہے۔ بہت سے نوجوان ہیں جو مزاج کے اعتبار سے مجھ سے بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اور بہت سے مُسن لوگ ہیں جو خیالات کے لحاظ سے مجھ سے بھی زیادہ نوجوان ہیں۔ لیکن ان کو یہی خیال ہے کہ اس اعتبار سے میری جوانی بہت ترقی کر رہی ہے۔ میں عقبیٰ کا معتقد نہیں اس لئے آخرت کا خیال جو انسان کی نوجوانی کے لئے سب سے زیادہ مہلک ہے مجھے کبھی ستاتا ہی نہیں ہے ، ہاں یہ ضرور ہے کہ جوانی بھی دو طرح کی ہوتی ہے ، ایک صحت بخش اور دوسری جنوں انگیز۔ صحت بخش جوانی کا خاصہ یہ ہے کہ انسان خطرناک غاروں سے بچتا ہوا ایک ترقی پذیر اور پر اُمید

راستہ اختیار کرے۔ جنون انگیز شباب میں آدمی اندھا رہتا ہے اپنی قابلیت کے متعلق مبالغہ آمیز خیال رکھتا ہے۔ اور اپنے ارمانوں کی تکمیل کے شاندار خواب دیکھا کرتا ہے۔ میں بھی کبھی کبھی خواب دیکھتا ہوں اور بعض اوقات ناعاقبت اندیشی بھی کر بیٹھتا ہوں، مگر افراط و تفریط سے بچا رہتا ہوں، اس لئے جنون کے بہتر ہی سے حظ اٹھاتا ہوں اور اب یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ قناعت کی گھریلو زندگی دنیا کی بہترین نعمت ہے۔"

جس آدمی کے عمل کی یہ نوعیت ہو کہ اس نے سمجھ سوچ کر ترقی پذیر اور پر اُمید راستہ اپنا لیا ہو جو جنون کو رہنما بنانے کی بجائے خود جنون کی رہنمائی کر رہا ہو، اُسے موت کہاں ستا سکتی ہے؟

اگست کا مہینہ تھا۔ اس بیماری کی حالت میں ایک دن رات کو دو بجے اُٹھ کر فرش پر بیٹھ گئے، لکھنے لگے۔ دو روز بعد "آج" کے آفس میں گوپی کی موت پر میٹنگ ہونے والی تھی، اس کے لئے تقریر لکھ رہے تھے۔ شورانی کو بھی ان دنوں نیند نہیں آتی تھی، تیمارداری میں لگی رہتی تھیں۔ انھوں نے کہا "جب طبیعت ٹھیک نہیں تو بھاشن کیسے لکھا جائے گا؟ اور پھر لکھنا کیا ضروری ہے؟"

آپ بولے:۔ ضروری تو نہیں ہے۔ بنا لکھے کام نہیں چلے گا۔ اپنی خوشی سے کام کرنے میں آرام یا تکلیف کا احساس نہیں ہوتا جس کو آدمی فرض سمجھ لیتا ہے، اس کو کرنے میں تکلیف نہیں ہوتی۔

ان کاموں کو آدمی سب سے زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔

شورانی:- یہ میٹنگ ہے کیسی؟

پریم چند:- افسوس کرنا ہے۔

شورانی۔ وہ کون ہندستانی تھے؟

پریم چند:- یہی تو ہم لوگوں کی تنگ دلی ہے۔ گورکی اتنا بڑا لیکھک تھا کہ اس کے متعلق قومیت یا وطنیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکھک ہندستانی یا یورپین نہیں دیکھا جاتا۔ وہ جو کچھ لکھے گا اس سے سبھی کو فائدہ ہوتا ہے۔

شورانی:- ٹھیک۔ اس نے ہندوستان کے لئے بھی کچھ لکھا؟

پریم چند:- تم غلطی کرتی ہو رانی! لیکھک کے پاس ہوتا ہی کیا ہے، جسے وہ الگ بانٹ دے۔ لیکھک کے پاس تو اس کی تپسیا ہی ہوتی ہے۔ وہی سب کو وہ دے سکتا ہے۔ اس سے سب لوگ مستفید بھی ہوتے ہیں۔ لیکھک جو تپسیا کرتا ہے اس سے جنتا کا بھلا ہوتا ہے۔ وہ اپنے لئے تو کچھ بھی نہیں کرتا۔

شورانی:- گاؤں والوں میں تو شاید ہی کوئی گورکی کا نام جانتا ہو؟

پریم چند:- یہاں کے گاؤں کی بات چھوڑو؟ یہاں کے لوگ تو انہوں کو نہیں جانتے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ یہاں کے لوگوں کے لئے کچھ کام ہی نہ کیا جائے۔

شورانی:- جانتے کیوں نہیں؟ تلسی، سور، کبیر وہ کس کو نہیں

جانتے ؟

پریم چند:۔ ان کو بھی جاننے والے گاؤں میں تھوڑے ہیں۔ اس کا سبب ہے تعلیم کی کمی۔ ابھی یہاں تعلیم بہت تھوڑی ہے، اس وجہ سے یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ بہت تھوڑے لوگوں کے لیئے ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب گھر گھر تعلیم کا پرچار ہو جائے گا تو کیا گورکی کا اثر بھی گھر گھر نہیں ہو جائے گا؟ وہ بھی تلسی داس کی طرح چاروں طرف پوجے جائیں گے۔"

کمزوری اور نقاہت کے باوجود میٹنگ میں گئے، زینہ چڑھتے چڑھتے دم اُکھڑ گیا۔ میٹنگ میں کھڑے نہیں ہو سکے۔ کسی اور صاحب نے اُن کی تقریر پڑھ کر سنائی۔ لوٹ کر آئے تو پاؤں لڑکھڑا رہے تھے چلنا مشکل تھا۔ شیورانی نے شکایت کی۔ ناحق پریشانی اُٹھائی۔ نہ گئے ہوتے۔ آپ نے جواب دیا "کمزوری آگئے یا چاہیے جو کچھ کہیں اس طرح بیٹھا جاتا ہے"!

ستمبر کے آخر میں اُن کی حالت بہت خراب ہوگئی، معدہ میں گیسٹرک السر کی شکایت تھی کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا، جس کے مارے قے یا دست ہو جاتے تھے، ورنہ پیٹ پھولا رہتا تھا جیسے پانی بھر گیا ہو، وہ اکثر بے ہوش بھی رہنے لگے۔

موت سامنے تھی مگر انھیں موت کا ڈر نہیں تھا، آخرت کی فکر نہیں تھی۔ انھیں فکر تھی تو بس اس دنیا کی جس کو وہ سنوارنا اور حسین

بنانا چاہتے تھے، اور اس دنیا کو کیسے سنوارا جا سکتا ہے۔ اس کا اصل گیان انھیں حال ہی میں — نک سنیا گرہ کی سمجھوتہ بازی کے بعد ہوا تھا دشمن صاف روپ میں سامنے تھا، اور اس پر وہ بھرپور وار کر رہے تھے۔ اُن کی آخری کہانی "دو بہنیں" ہیں جو اکتوبر ۱۹۳۶ء میں "عصمت" دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں اُن کا ایک کردار کہتا ہے۔

"جتنے دولت مند ہیں، لٹیرے ہیں۔ میں بھی انھی میں ایک ہوں کل میرے پاس روپے ہو جائیں اور میں ایک دھرم شالہ بنوا دوں۔ پھر دیکھئے میری کتنی واہ واہ ہوتی ہے۔ کون پوچھتا ہے۔ مجھے یہ دولت کہاں سے ملی ہے"

وہ اس نظام کو جس میں دھوکے دھڑی اور فریب سے دولت کمانا جائز ہے، جس میں بلیک مارکیٹ اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعے محنت کش طبقے کا گوشت نوچنے والا گدھ اور لٹیرا ایک دھرم شالہ بنا کر "دان دیر" اور "دھرماتما" کہلاتا ہے، اسے وہ ختم ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ "منگل سوتر" میں انھوں نے جو کہانی شروع کی تھی یہی اس کا انجام تھا۔ اگر وہ خود اسے نکتۂ عروج تک نہیں پہنچا سکے تو کم از کم ایسی جزئیات فراہم کر دینا چاہتے تھے کہ ان کے بعد آنے والے دوسرے ادیب اس کا انجام لکھ سکیں۔

اپنا یہ پیغام وصیت کرنے کے لئے انھوں نے آخری وقت میں اپنے تمام دوستوں اور رشتہ داروں کو جمع کر لیا تھا، لڑکے لڑکی

بھائی اور سالے کے علاوہ ان کے عزیز دوست منشی دیا نارائن نگم، جینندر کمار جین وغیرہ بنارس پہنچ گئے۔

منشی دیا نارائن نگم لکھتے ہیں:۔

"موت سے پندرہ دن پہلے تار دے کر مجھے بنارس بلایا۔ تمام راستہ عجیب اُمید و بیم کی حالت میں کٹا۔ صبح کو آخری ملاقات کا سماں عمر بھر نہ بھولے گا۔ نہ کبھی پریم چند جو اپنی سُرخ و سپید صورت کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک تھے، ایسے زار و نزار ہو گئے تھے کہ مشکل سے پہچان پڑتے تھے۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، بیٹھے ہوئے گال۔ کانٹے کی طرح سوکھے ہوئے ہاتھ پاؤں دیکھ کر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ان کے مسلسل قہقہے بات کرنے کی بھی مہلت نہ دیتے تھے، مگر اب آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ نہ اُٹھنے کی طاقت تھی، نہ بیٹھنے کی سکت۔ لیٹے ہی لیٹے ہاتھ پکڑ لیا اور گلے سے چمٹا لیا، جیسے کوئی ڈرا ہوا بچہ بلک بلک کر سینے سے چمٹنے کی کوشش کرے۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ بات کرتے بھی تھکن ہوتی تھی۔ تاہم دم لے لے کر آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہی رہے۔ میں نے منع کرنا چاہا تو کہنے لگے کہ دوبارہ ملاقات کی اُمید نہیں۔ ورنہ تمھارا کہنا نہ ٹالتا۔ یہاں اور جو کوئی آتا ہے یاس انگیز باتیں کر کے پریشان کر جاتا ہے۔ بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر یہ ڈھارس نہ بندھائے رہتیں تو کب کا مر چکا ہوتا۔ واقعی مسز پریم چند نے ان دنوں بڑی ہمت سے کام لیا اور دل شکن حالات

ہیں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے دلی صدمے کو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اگر کبھی انھوں نے کوئی مایوسی کی بات بھی کی تو سمجھا بجھا کر تسلی دے دی - اسی لئے کہتے تھے کہ ان کے بغیر خدا معلوم میرا کیا حال ہوتا ...."

نگم کی طرح جنندر بھی اُن کے گہرے دوست تھے۔ لیکن یہ سوچنا پڑتا ہے کہ دوستی جنندر نبھاتے تھے یا پریم چند کیونکہ دونوں کے راستے مختلف تھے، نظریے مختلف تھے۔ جنندر نے اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی پریم چند کو اور اُن کے آدرشوں کو نہیں سمجھا تھا اور شاید اب تک نہیں سمجھا۔ وہ انھیں اپنی ہی طرح آستک یعنی خدا پرست بنانے کی دھن میں تھے۔

پریم چند انھیں جواب دیتے " یہ آہیں اور کراہیں، یہ دکھ اور درد، یہ افلاس، یہ بھوک اور یہ ...."

جنندر کہتے ۔ "آہوں، کراہوں سے اوپر اُٹھو - اِدھر دیکھو ایشور کی طرف !"

لیکن پریم چند کی جڑیں تو جنتا میں تھیں، وہ آہوں سے اوپر کیسے اُٹھتے۔ "قہرِ خدا" کہانی میں شاید جنندر ہی اُن کے مخاطب ہیں اور وہ ایشور کے متعلق دوٹوک جواب دیتے ہیں:-

" محبت ہی ہماری زندگی کی حقیقت ہے، مگر تمھارا ایشور اپنے قہر اور عذاب کے خوف سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے .... ایسے

ایشور کی عبادت میں نہیں کرنا چاہتا۔ جو لوگ موٹے ہیں اُن کے لئے ایشور ہوگا، کیونکہ وہ دنیا کو اس کی رحمی کی بدولت لوٹتے ہیں۔ ہم جیسوں کو تو ایشور کی دیا کہیں نظر نہیں آتی۔ ہاں اس کی سزا کا خوف قدم قدم پر کھڑا گھور رہا ہے ...."

لیکن جنیندر نے بحث جاری رکھی اور ایشور اور ستیہ (سچائی) میں تعلق جوڑنے کی کوشش کی تو پریم چند اور واضح ہو گئے۔

"جب تک دنیا کا یہ نظام قائم ہے مجھے ایشور پر وشواش نہیں آنے کا۔ اگر میرے جھوٹ بولنے سے کسی کی جان بچتی ہے تو مجھے مطلق تامل نہ ہوگا۔ میں ہر ایک فعل کو اس کے اسبابِ تحریک کے اعتبار سے دیکھتا ہوں، جس سے دوسروں کا بھلا ہو وہی سچ ہے۔ جس سے دوسروں کو نقصان ہو وہی جھوٹ ہے۔"

جنیندر کو اُمید تھی کہ وہ مرنے سے پہلے ایشور کو یاد کریں گے، اور ہر ایک آستک اسی خام خیالی میں مبتلا رہتا ہے جنیندر کی یہ اُمید پوری نہیں ہوئی۔ وہ پریم چند کے قریب بیٹھے تھے انھوں نے اپنا داہنا سوجا ہوا ہاتھ بڑھا کر جنیندر سے کہا "دبا دو" پریم چند آدھی رات تک باتیں کرتے رہے۔ وہ باتیں "ہنس" سے متعلق تھیں۔ ادب اور اس کے مستقبل سے متعلق تھیں۔ اُن کی آرزوئیں اور تمنائیں الفاظ سے کہیں زیادہ آنکھوں سے نمایاں

تھیں۔

آخر صبح ۔ ۸ ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو عمل کی قوت ختم ہوگئی ۔ دنیا کا روپ نکھارنے والا قلم رُک گیا ۔ زندگی کو اجالنے والا چراغ گل ہو گیا ۔ اور یوں اُنھوں نے اپنی زندگی کی کہانی کو نکتۂ عروج پر پہنچا کر ختم کر دیا ۔

آرٹ

ادب اپنے زمانے کا عکس ہوتا
ہے جو جذبات اور خیالات لوگوں
کے دلوں میں ہل چل پیدا کرتے ہیں
وہی ادب میں اپنا سایہ ڈالتے ہیں (پریم چند)

پریم چند کی زندگی کے مطالعہ کے بعد اُن کے ادب پر بحث کی زیادہ گنجائش نہیں رہتی۔ ہر ایک ادیب کا آرٹ اس کی شخصیت کا حصہ ہوتا ہے۔ کوئی ادیب جتنا ہی اپنے وقت کی روح کو پہچان لیتا ہے اور تاریخ کی ارتقاء پذیر حقیقتوں کو سمجھ کر اُن کا ساتھ دیتا ہے اُتنا ہی اس کا ادب بلند، مؤثر اور ہمہ گیر ہوتا ہے اور اتنا ہی وہ مستقل اور

دائمی قدروں کا حامل ہوتا ہے۔ پریم چند نے قریب قریب تین سو افسانے اور لگ بھگ ایک درجن ناول لکھے۔ انھیں سلسلے وار پڑھنے سے ہمارے ملک کی بیسویں صدی کے شروع پینتیس چھتیس سال کی تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔ گویا پریم چند کے ادب کی تاریخ ہمارے ملک کی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی تاریخ ہے۔

لیکن اُن کا ادب صرف اپنے زمانے کا عکس ہی پیش نہیں کرتا بلکہ انھوں نے زندگی کے جو گہرے اور اَن مٹ نقوش تیار کئے ہیں اُن سے ہمیں یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ نقوش آگے کس سمت میں بڑھ رہے ہیں اور واقعات کے تاریخی دھارے کا آئندہ رُخ کیا ہے۔ یعنی ادیب کا کام صرف زندگی کو پیش کرنا ہی نہیں بلکہ جہاں زندگی کی کمی ہو وہاں اُسے تخلیق کرنا بھی ہے، اور پریم چند نے یہ فریضہ بھی اچھی طرح سرانجام دیا ہے۔ اپنے گردوپیش کا جائزہ لے کر وہ بڑے اطمینان سے کہتے ہیں "یہ سب ہوتے ہوئے بھی ہمارا مستقبل بہت روشن ہے مجھے اس میں مطلق شبہہ نہیں، ہندوستان کی روح ابھی زندہ ہے۔"

"میدانِ عمل"

تبدیلیاں ہمیشہ شخصیتوں اور واقعات میں رونما ہوتی ہیں لیکن ان تبدیلیوں کا سبب سامنے آنے والی شخصیتوں اور واقعات ہی میں نہیں بلکہ سماج میں موجود ہوتا ہے۔ ادیب کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان شخصیتوں اور واقعات کا تجزیہ کر کے ان اسباب کی جڑیں سماج میں تلاش کرے جتنا وہ اس مقصد میں کامیاب ہوتا ہے اتنا ہی اُسکا

ادب موثر اور مفید ہوتا ہے اور جہاں وہ تجزیہ کرنے میں ناکام رہتا ہے وہیں اس کا ادب غیر موثر اور کمزور ہو جاتا ہے۔

اسی بات کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ادب سماج میں سے چند شخصیتوں اور واقعات کو مثال کے طور پر چن لیتا ہے اور ان کی روشنی میں مجموعی زندگی کا تجزیہ کرتا ہے۔ خود پریم چند نے اس بات کو یوں پیش کیا ہے:-

"ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ چاہے وہ مثالوں کی شکل میں ہو، یا انسانوں کی یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔"

لیکن تنقید حیات ادب کی پہلی منزل ہے۔ ادب کا کام اس منزل پر رک جانا نہیں۔ بلکہ آگے بڑھتا ہے۔ بالزک اور چارلس ڈکنز وغیرہ ادیبوں نے بھی اپنے سماج کی بڑی بے باکی سے تنقید کی ہے۔ کیونکہ انھیں یہ خطرہ نہیں تھا کہ ایسا کرنے سے وہ سماج کی جڑیں ہلا دیں گے اور نہ ہی انھیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی تھی، کیونکہ سرمایہ داری اپنے عروج پر تھی اور اس کی مدِ مقابل کوئی ایسی تحریک نہیں تھی جس کا مقصد اس سے بہتر سماج قائم کرنا ہو۔ اس وقت تنقیدِ حیات ہی ادب کی بہترین تعریف تھی۔

لیکن جب سماج انقلابی دور میں سے گذر رہا ہو، جب پرانے اور بوسیدہ سماج کی جگہ نئے اور بہتر سماج کی تعمیر کے لئے جد و جہد جاری ہو تو ادیب کا کام جانب داری کے ساتھ لوگوں کو اس تحریک کے لئے

تیار کرنا ہوتا ہے۔ اگر اس وقت تنقید کو ترغیبِ عمل سے الگ رکھا جائے
تو ادب ادب نہیں رہتا یا کم از کم ادیب اپنا پورا فرض سرانجام نہیں دیتا
ایسے دور میں بہتر اور صحیح ادب وہی ہوتا ہے جس میں تنقیدِ حیات کے
ساتھ ترغیبِ عمل بھی گتھی رہتی ہے۔ پریم چند گو تنقیدِ حیات کو ادب
کی بہترین تعریف کہتے ہیں لیکن وہ خود ترغیبِ عمل بھی دیتے ہیں :-
"جس قوم کی بنیاد وہی بے انصافی پر ہو اس کی سرکار کے پاس
سختی کے سوا اور کیا دوا ہو سکتی ہے۔ ایک دن آئے گا جب آج کے
دیوتا کنکر پتھر کی طرح اٹھا اٹھا کر گلیوں میں پھینک دئے جائیں گے"۔

"میدانِ عمل"

لیکن یہ منزل بھی دوسری منزل ہے، آخری اور تیسری منزل اس
سے آگے ہے جو کافی کٹھن ہے اور دشوار گذار ہے۔ ادیب کا اصل امتحان
اس منزل پر پہنچ کر ہوتا ہے۔ یہیں کھرا اور کھوٹا پرکھا جاتا ہے۔ یہ منزل
ہے عمل کو کامیابی کے ساتھ اپنے فطری نتیجے تک لے جانا۔ سماج کی نئی
طاقتوں کو پرانی اور بوسیدہ طاقتوں سے ٹکرا دینا۔ یہ کام سہل نہیں
بہت کٹھن ہے۔ ادیب اپنے طبقے کے اعتبار سے پرانے سماج کے ساتھ
ہزار رشتوں سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ جب تک وہ ایک ایک رشتہ
توڑ کر اپنے آپ کو پرانے سماج سے الگ نہ کرے۔ جب تک کہ وہ شعوری
طور پر اپنے آپ کو نئے سماج سے پوری طرح وابستہ نہ کر لے۔ جب تک
کہ وہ اپنے آپ کو نئے سماج کی نئی قوتوں کا ہی ایک جزو نہ بنالے تو کنکر

پتھر کے دیوتاؤں کو اٹھا کر پھینکتے وقت اس کا ہاتھ کانپ جائے گا ۔ اپنے عمل کو ادھورا چھوڑ دے گا ، اور کمزوری اور پسپائی کو چھپانے کے لئے باطل فلسفے کی آڑ لے گا ۔

جب ہم اس منزل پر پہنچتے ہیں تو پریم چند کا تضاد اُبھر آتا ہے ۔ ہمیں اُن کی ذہنی حدود کا پتہ چل جاتا ہے ۔ تب ہمیں معلوم ہو جاتا ہے ، کہ انھوں نے ادب اپنے زمانے کا عکس ہوتا ہے " کیوں کہا ہے اور انھوں نے صرف تنقیدِ حیات ہی کو ادب کی بہترین تعریف کیوں بتایا ہے ' جب کہ وہ خود اس سے بہت آگے جاتے ہیں ؟

پریم چند نے چونکہ تحریک آزادی کو بڑھانے کے لئے ادب کی تخلیق کی تھی ۔ اور خود بھی ملازمت سے مستعفی ہو کر اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے ۔ اس لئے انھوں نے جیتے جاگتے باعمل کردار پیش کئے ہیں جو صرف تحریکِ آزادی کی بابت سوچتے ہی نہیں بلکہ تحریک میں شامل ہو کر اس میں عملی حصہ لیتے ہیں ۔ لیکن ان کے عمل کی ایک حد قائم ہے ۔ جب عمل اس سے آگے بڑھنے لگتا ہے تو وہ اسے جھٹ روک دیتے ہیں ، اور جھوٹے فلسفے کی آڑ لے کر اپنے من کو تسکین دیتے ہیں اور بعض مرتبہ تو تسکین بھی حاصل نہیں ہوتی ، دل میں کرید لگی رہتی ہے ۔

مثلاً ان کا ناول " پردۂ مجاز " یعنی " کایا کلپ " کو لیجیے ۔ اس کا ہیرو چکر دھر پرجوش اور پرخلوص نوجوان کی شکل میں ہمارے سامنے آتا

ہے۔ اسے سماج کی فرسودہ روایات، غلامی اور سفلہ پن سے نفرت ہے، وہ آزاد، حسین اور بہتر دنیا کا متمنی ہے۔ اس لئے وہ معقول باتیں کرتا ہے۔ ہم اسے نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہوئے سنتے ہیں "میں بدنامی کے خوف سے بے انصافی کرنا روا نہیں سمجھتا!" اور انصاف اور بے انصافی کی جڑیں مادی حالات میں ہوتی ہیں اس لئے چکر دھر کہتا ہے :-

"یہ مادیت ہمیں روحانیت کی طرف لے جائے گی۔ ہستی کے وہ اسرار جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا ہے کھل جائیں گے "

(پردہ مجاز)

وہ باعمل نوجوان ہے، خاندانی رسم ورواج سے بغاوت کرتا ہے ہندو مسلم فساد روکنے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دیتا ہے، لوٹ کھسوٹ ظلم اور بے انصافی کے خلاف ستیہ گرہ کرتا ہے۔ مظلوم طبقے کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن جب کھیت مزدور لوٹ کھسوٹ سے تنگ آکر ظلم کو مٹانے پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ راجہ کے کارندوں، افسروں اور سپاہیوں پر حملہ کرتے ہیں، چکر دھر کا دل کانپ جاتا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اور خود زخمی ہو کر اُن کے اس فطری عمل کو روک دیتا ہے اور دل کو سمجھانے کے لئے باطل فلسفے کی آڑ لیتا ہے :-

"وہ سوچ رہا ہے، یہ خون ریز ہنگامہ کیوں ہوا۔ میں نے تو بھول کر بھی کسی سے یہ تحریک نہیں کی۔۔۔۔۔۔ یہ ہماری نیت کا نتیجہ ہے ہمارے

پیغام صلح کی تہہ میں نفس پروری چھپی ہوئی ہے۔ اگر ہماری نیت صاف ہوتی تو مخلوق کے دلوں میں راجاؤں پر چڑھ دوڑنے کا جوش ہی پیدا نہ ہوتا۔"

ظاہر ہے کہ یہاں چکردھر نے مادیت کے فلسفہ کو الگ پھینک کر روحانیت کا خول اوڑھ لیا ہے اور وہ کھیت مزدوروں کے فطری غصے کے مادی اسباب نظر انداز کر کے اسے "نیت" "دلوں" اور "افراد" سے وابستہ کر رہا ہے۔ جو خالصتاً رجعت پسندی کا خاصہ ہے۔ لیکن چونکہ وہ شعوری طور پر رجعت پسند نہیں بلکہ ایمان دار ہے۔ اس لیے اُسے اس باطل فلسفہ سے تسکین نہیں ملتی۔ دل میں کرید لگی رہتی ہے۔ سوچتا ہے :-

"پھر اگر ظلم کی مخالفت نہ کی جائے تو تنظیم سے فائدہ ہی کیا؟"

اب ہوتا یہ ہے کہ چونکہ تنظیم سے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا اس لیے چکردھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سنیاس دھارن کر لیتا ہے۔ گمنامی اور بے عملی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ چونکہ مادیت کا راستہ چھوڑ دیا اس لیے ہستی کے اسرار پر پردہ ہی پڑا رہتا ہے۔ اور پریم چند کے آرٹ نے آواگون کے گورکھ دھندا میں الجھ کر اپنا جوہر کھو دیا ہے ایک غیر مارکسی ادیب نے اس ناول پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے "ربط اور روانی پہلے حصہ میں کچھ زیادہ ہے مگر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے غائب ہو گئی"۔ وجہ معلوم!

اسی طرح "ڈائل کا قیدی" کہانی اس وقت تک دلچسپی کا باعث بنی رہتی ہے جب تک پریم چند مل کے مالک سیٹھ کی زر پرستی، منافع خوری اور ریاکاری کی قلعی کھولتے ہیں اور مزدوروں کے عمل کو ابھارتے ہیں۔ لیکن جب گوپی ناتھ مزدوروں کے عمل کی رہنمائی کرنے کے بجائے اُن کے غصّہ اور سیٹھ کے درمیان آکر ہڑتال توڑنے کا کام کرتا ہے، اور گھائل ہوکر مرجاتا ہے تو پھر ذہنی آدا گون کا غیر فطری عمل شروع ہوتا ہے۔ اور کہانی بے اثر اور غیر دلچسپ ہوکر رہ جاتی ہے۔

ان کے ایک دوسرے ناول "میدانِ عمل" کو لیجئے۔ اس ناول کا ہیرو۔ امر کانت، چکردھر سے بہتر شعور کا مالک ہے۔ اس کے کردار میں زیادہ سلجھاؤ اور استحکام ہے جو تجربے اور عمل سے پیدا ہوا ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے اس کا ارتقا ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ چکردھر سے بہت آگے کی بات سوچتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء کی ملک کی تحریک میں ۱۹۲۱ء کی خلافت کا مذہبی رنگ شامل نہیں تھا۔ اب تحریک آزادی مذہبی جذبہ نہ رہ کر ٹھوس اقتصادی تصور بن گیا تھا اور اس میں نوجوانوں کا انقلابی جذبہ شامل تھا، چنانچہ پریم چند کا یہ ہیرو بھی اپنے ماحول کے مطابق اسی انداز سے سوچتا ہے:۔

"امر انقلاب ہی میں ملک کی نجات سمجھتا تھا۔ ایسے انقلاب میں جو عالم گیر ہے جو زندگی کے غلط اصولوں کا، مہلک رسوم کا اور مہلک بندشوں کا خاتمہ کردے جو ایک نئے دور کا حامل ہو۔ ایک نئی دنیا

آباد کرے۔ جو مٹی کے ان گنت دیوتاؤں کو توڑ پھوڑ کر زمین دوز کر دے جو انسان کی ثروت اور مذہب کی بنیادوں پر ٹکنے والے نظامِ حکومت سے آزاد کر دے"

چنانچہ وہ اپنے اس خیال کو عملی شکل دینے کے لئے سود خور اور چوری کا مال ہڑپ کرنے والے باپ سے بغاوت کرتا ہے۔ اس کا گھر اور دولت تیاگ کر گاؤں میں جا کر کسانوں اور کھیت مزدوروں میں رہنے لگتا ہے لیکن جب یہی کسان مزدور اس کے خواب کو عملی شکل دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ثروت اور مذہب کی بنیادوں پر ٹکنے والے نظامِ حکومت سے آزاد ہونے کے لئے حملہ شروع کرتے ہیں تو اپنے سی "مہذب" اور "تعلیم یافتہ" طبقے کو ان گنواروں کی چوٹ کی زد میں آتے دیکھ کر امر کا دل لرز جاتا ہے۔ اور وہ غصہ ور ہجوم کے سامنے لیٹ کر اپنے لنگوٹیے ساتھی سلیم کو صاف بچا لیتا ہے۔

اب چونکہ امر ستیاگرہ کر کے جیل خانے ہی کو عمل کی آخری منزل سمجھ لیتا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں کریدھی پیدا نہیں ہوتی جو چکردھر کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس کا سود خور باپ بھی ہردیہ پریورتن" کے چکر سے شدھ ہو کر جیل میں آ جاتا ہے، اور وہاں سے رہا ہو کر بیٹا باپ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس گھر کو واپس لوٹ جاتا ہے جہاں سے بغاوت کر کے وہ عالم گیر انقلاب کرنے نکلتا ہے۔

یہ ستیاگرہی کی جیت ہوسکتی ہے۔ لیکن انقلابی کی شکست میں کلام نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پریم چند کا ہیرو یا آرٹ یہ شکست کیوں قبول کرتا ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟

پریم چند کو اصلاح پسند بتانے والے ادیب اور تنقید نگار کہتے ہیں کہ یہ گاندھی ازم ہے۔

ان کی یہ بات ماننے سے کسی کو بھی تامل نہیں ہوسکتا۔ بے شک یہ گاندھی ازم ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ گاندھی ازم کی سماجی بنیاد کیا ہے؟

جس طرح سماج میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں شخصیتوں اور واقعات میں رونما ہوتی ہیں، اسی طرح سماج سے پیدا ہونے والا ہر فلسفہ بھی شخصیتوں اور واقعات میں رونما ہوتا ہے۔ کسی فلسفہ کو ایک شخص کی ذات سے منسوب کیا جا سکتا ہے لیکن وہ اس پر وحی یا نازل نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اس شخص کی ذات کے ساتھ پیدا ہوتا اور مر جاتا ہے۔ یہی اصول گاندھی ازم پر صادق آتا ہے جو گاندھی کی ذات سے منسوب ضرور ہے لیکن ہمیں اس کی جڑیں اپنے طبقہ واری سماج میں طبقوں میں ڈھونڈنے سے ملیں گی۔

پریم چند ۱۹۳۶ء میں ہندی ساہتیہ پریشد کی میٹنگ کے سلسلے میں وردھا گئے اور یہاں ان کی گاندھی سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی، لوٹ کر آئے تو اس ملاقات کا ذکر شورانی سے کیا۔ وہ گاندھی کی شخصیت سے

بہت متاثر تھے۔ شورانی بولیں۔ اس کا مطلب ہے آپ بھی مہاتما گاندھی
کے چیلے ہو گئے۔

پریم چند:۔ چیلا بننے کا مطلب کسی کی پوجا کرنا نہیں۔ اس کے گنوں
کو اپنانا ہوتا ہے۔ میں نے انھیں اپنا کر ہی تو "پریم آشرم"
(گوشۂ عافیت) لکھا جو ۱۹۲۲ء میں چھپا ہے۔

شورانی:۔ وہ تو پہلے ہی سے لکھا جا رہا تھا۔ اس میں مہاتما گاندھی
کی کون خاص بات ہوگی۔

پریم چند:۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو کام کرنا چاہتے ہیں اسے
میں پہلے ہی کر رہا ہوں۔

شورانی:۔ یہ تو کوئی دلیل نہ ہوئی۔

پریم چند نے کہا کہ دلیل کی بات نہیں، وہ بھی مزدوروں کسانوں
کی بھلائی کے لئے آندولن چلا رہے ہیں اور میں بھی قلم سے یہی کچھ
کر رہا ہوں۔

ہزاروں، لاکھوں ہندوستانیوں کی طرح پریم چند نے بھی
بھول سے یہ سمجھ لیا کہ گاندھی جو کچھ چاہتے ہیں وہ پہلے ہی سے وہی
کچھ کر رہے تھے۔ "گوشۂ عافیت" میں منوہر خوش خاں کو قتل کرتا ہے
اور پریم چند نہایت جانبداری سے اس کے فعل کی تائید کرتے ہیں
اور اسے بیر آتما اور سورما بتاتے ہیں۔ لیکن گاندھی جی نے منوہر
کے فعل کی کبھی تائید نہیں کی، بلکہ وہ منوہر کے عمل کو آدھے ہی میں

روکنے کے لئے منظر عام پر آئے تھے۔ کانگریس کے لیڈر بنے تھے

منوہر کا فعل کوئی انفرادی فعل نہیں تھا، وہ اس طبقے کا فعل تھا جو لوٹ کھسوٹ سے اور اپنے افلاس سے عاجز آچکا تھا غوث خاں کے بعد اس کا اگلا وار گیان شنکر زمیندار، اس کے آقا انگریز اور سارے خون چوسنے والے طبقے پر پڑتا تھا۔ جنگ کے بعد عوام کا یہ اجتماعی عمل شروع ہوگیا تھا۔ اس عمل کو روکنے کے لئے ہی جلیانوالہ باغ کا خوں چکاں واقعہ وجود میں آیا۔ لیکن عوام کا جوش گولیوں سے نہیں بجھا کرتا۔ اگر ان کے عمل کو قدرتی ڈھنگ سے آگے بڑھنے دیا جاتا تو گولیوں سے تپ کر نکلنے والے عوام نہ صرف انگریزی حکومت کو بلکہ ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کو ختم کرکے دم لیتے اور پریم چند ان کی جس عظمت کے قائل تھے وہ دل کے نہاخانوں سے ابھر کر سطح پر آجاتی۔

سرمایہ دار طبقہ نے بھی عوام کے یہ تیور پہچان لئے تھے اور ان سے وہ فطرۃً خوف زدہ تھے۔ اب تک کانگریس کی تحریک کچھ پڑھے لکھے لوگوں اور ان کے اپنے طبقے تک محدود تھی محنت کش عوام پہلی مرتبہ آزادی کی مبارزہ جہد میں شامل ہو رہے تھے۔ ان کے عمل کو اس حد تک ابھارنا ضروری تھا کہ غیر ملکی حکومت سے مراعات حاصل کی جاسکیں سمجھوتہ ہوسکے، جان کی جگہ گوبند کو گدی پر بٹھایا جاسکے لیکن اس عمل کو لوٹ کھسوٹ کے نظام سے، اس سماج سے ٹکرانے سے روکا جائے

اس خوف اور دور اندیشی کا نام گاندھی ازم ہے جس کا مقصد جائداد کی حفاظت اور صاحبِ جائداد طبقہ کی حفاظت ہے۔ گویا گاندھی ازم وہ درخت ہے جس کی جڑ جائداد کا تحفظ ہے۔ "رام راج"، "ٹرسٹی شپ"، "ہردیہ پریورتن"، ستیاگرہ اہنسا اور ستیہ کی چھوٹی شاخیں ہیں۔

ملک میں مزدور تحریک اتنی مضبوط نہیں تھی کہ گاندھی ازم کا تجزیہ کر کے اس کے طبقاتی کردار کو سمجھ لیا جاتا۔ درمیانہ طبقہ کے آزادی پسند پرخلوص نوجوانوں نے اس فلسفے کو اپنا لیا، کیونکہ اس کے سامنے جدوجہد کا اور کوئی وسیع پروگرام نہیں تھا اور پھر گو درمیانہ طبقہ کام کے اعتبار سے مزدور طبقہ کے قریب ہوتا ہے، لیکن سماجی اعتبار سے وہ سرمایہ دار طبقہ کی روایات کو اپناتا ہے۔ اس کے ذہن میں بھی جائداد اور وراثت کے تحفظ کا جذبہ موجود رہتا ہے۔

پریم چند بھی درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی بھی گاؤں میں جدّی زمین تھی، موروثی گھر تھا، اور انھیں "گھر" سے وہی اُنس تھا جو درمیانہ طبقہ کے لوگوں کو ہوتا ہے۔ اس اُنس کے کارن وہ بار بار دیہات لوٹ جانے کی خواہش کرتے رہے۔ آخر میں وہ دیہات میں گئے۔ اور بزرگوں کے کچے مکان کی جگہ پکا مکان بنوایا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ سنہ ۱۹۳۰ء کی تحریک میں ہزار خواہش کے باوجود جیل نہیں جا سکے یہی سوچتے رہے کہ شورانی چلی گئیں، اگر وہ بھی چلے گئے تو بچوں کا اور گھر کا خیال کون رکھے گا؟

ستیاگرہ کی لڑائی اسی طرح لڑی جاتی تھی کہ گھر بھی بنا رہے اور جیل یاترا بھی ہو جائے اور بڑے آدمی جب جیل جاتے تھے تو ان کا کاروبار بدستور چلتا رہتا تھا۔

پریم چند نے زندگی کو کھلاڑی کی طرح گذارنے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ یہ کھلاڑی پن کا فلسفہ بھی گاندھی ازم کی ایک شاخ ہے۔ اس نے بہت سے لوگوں کو کھلاڑی بنایا ہے، لیکن ان کے عمل کو چرخے سے باندھے رکھا ہے۔ پریم چند کے امر کانت اور چکر دھر بھی کھلاڑی تھے نہایت خلوص اور ایمان داری سے تحریک میں شامل ہوئے تھے، لیکن آج انھیں ڈھونڈنا ہو تو وہ کانگریس کے بڑے لیڈروں، عہدہ داروں اور وزیروں میں ملیں گے، چونکہ انھوں نے اپنے فعل کا تجزیہ کر کے اس کی خامیوں کو نہیں سمجھا چونکہ وہ اہنسا کے پجاری بن کر شکست کو ہی جیت تصور کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہنستے ہنستے ریاکاری اُن کی زندگی کا جزو بن گئی اور اب وہ اپنی اس ریاکاری سے گاندھی ازم کو مجسم کر رہے ہیں۔

پریم چند کے ہاں بڑا کھلاڑی —— گاندھی جی کا دوسرا روپ "رنگ بھومی" کا ہیرو سورداس ہے جو ایک پیسہ کے لئے تین تین میل دوڑ لگاتا ہے، جو باپ دادا کی میراث۔ اپنی زمین کی حفاظت کے لئے تن تنہا اور انفرادی ڈھنگ سے لڑتا ہے اور حقیقتوں سے بالکل بے نیاز ہو کر کھلاڑی کی طرح لڑتا ہوا مر جاتا ہے۔ پریم چند

اسے سچا ستیاگرہی اور آدرش آدمی کہتے ہیں اور اسے پیش کرنے میں فن کارانہ
جانبداری سے کام لیتے ہیں۔

یہ آدرش جائداد کے تحفظ کا آدرش ہے۔

اپنے موروثی کردار کو بدلنا سہل نہیں، بہت مشکل ہے۔ انسان
اپنے طبقہ کی بوسیدہ روایات کو جھٹک کر ہزار بار آگے بڑھتا ہے اور
وہ ہزار بار راستہ کاٹ کر اور نیا روپ بھر کر سامنے آجاتی ہیں،
پریم چند نے "گوشۂ عافیت" میں جن روایات کا دامن جھٹک دیا تھا گاندھی
ازم کے روپ میں وہ پھر سامنے آ گئیں اور انھوں نے بنا پہچانے انھیں
سینے سے لگا لیا۔

اس کے بعد جب ستیاگرہ، اہنسا اور جلوسوں سے ان کا یقین
اُٹھ جاتا ہے اور "بھاڑے کے ٹٹو" کہانی کا ہیرو رمیش جیل سے رہا ہونے
کے بعد جماعتی انقلاب کا اعلان کر دیتا ہے، لیکن پھر "کفن" کہانی میں صرف
تنقید حیات پر اکتفا کرتے ہیں، کھیت مزدوروں کے عمل کو بالکل نہیں
اُبھارتے۔ انھیں صرف چنڈو خانے میں لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

۳۰ - ۳۱

۲۹ء سن انتیس، تیس میں اور پینتیس، چھتیس تک مزدور تحریک بہت
زور پکڑ گئی تھی۔ انھوں نے کانپور، احمد آباد اور بمبئی میں بڑی بڑی
ہڑتالیں لڑی تھیں، پریم چند ان کا ذکر نہیں کرتے۔ اپنی تخلیقات کو
درمیانہ طبقے تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ "گئودان" میں مزدوروں کی ہڑتال
کا ضمنی سا ذکر ہے، اسے بھی بُری طرح کچل دیا جاتا ہے۔ اور ان کے تشدد

کا انتقام کھنہ کے مل کو اتفاقاً آگ لگاکر جذباتی ڈھنگ سے لیا گیا ہے۔ "مل مزدور" فلم میں سمجھوتہ کمیٹی یا صلح کمیٹی موجود ہے، اور "ڈائل کا قیدی" کہانی میں مزدوروں کی جدو جہد کے سیلاب کو آواگون کے رنگ نے زار نے جاذب کر لیا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود انسانیت دوستی پریم چند کے ادب کی جان ہے۔ وہ کسی طرح لوٹ کھسوٹ، ظلم اور بے انصافی برداشت کرنے کو تیار نہیں جس طرح بہار کے زلزلہ نے ان کے پکے مکان میں دراریں ڈال دی تھیں۔ اسی طرح زندگی کی تلخ اور ٹھوس حقیقتوں نے واقعات کے جھٹکوں سے ان کے گاندھی ازم میں دراریں ہی نہیں شگاف ڈال دیئے تھے۔ اس درخت کی شاخیں جھڑ چکی تھیں، صرف جڑ باقی تھی، لیکن گئودان میں وہ بھی ٹوٹتی اور سوکھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کیونکہ ہوری کسان جس زمین پر جان دیتا ہے اور قلاش ہوتے ہوئے بھی سرمایہ دار طبقہ کی روایات سے چپٹا ہوا ہے آخر اسے کھو کر مزدور بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

درمیانہ طبقہ کو لوٹ کر مزدور بنتے دکھانا گاندھی ازم کی عینیت کے فلسفہ کی شکست ہے اور پریم چند کے ترقی پذیر فن، فلسفہ اور ادب کی فتح پھول نے سمجھ لیا تھا کہ اس لوٹ کھسوٹ کے نظام میں درمیانہ طبقہ کے لئے اپنی ہستی قائم رکھنا ممکن نہیں یہ آئندہ قدم کی واضح سمت ہے۔ اسی سے اُن کے ادب میں تازگی اور نکھار آ رہا تھا۔

Rabia

ربیعہ

شہرت

ہماری زندگی کی سب سے بڑی
خواہش یہی ہے کہ ہم کہانی بن جائیں
اور ہماری شہرت ہر طرف بکھر جائے۔ (پریم چند)

پریم چند کو اپنی زندگی ہی میں کافی شہرت حاصل ہو گئی تھی - وہ اردو اور ہندی کے بہترین ادیب سمجھے جاتے تھے کوئی دوسرا افسانہ نگار اُن کے اُس پاس بھی نہیں آتا تھا ، اردو داں طبقہ نے انھیں "فطرت نگار" اور ہندی داں طبقہ نے "اپنیاس سمراٹ" کا خطاب دیا تھا - ان کی کہانیاں گجراتی ، میراٹھی اور بنگالی غیر ملکی زبانوں میں تو ترجمہ ہوئی ہی تھیں ، لیکن اس کے علاوہ انگریزی

اور جاپانی وغیرہ غیر ملکی زبانوں میں بھی کافی کہانیاں ترجمہ ہو چکی تھیں اور اُن کی شہرت اب تک پھیل رہی ہے ۔ ابھی روسی زبان میں "گئودان" کا ترجمہ ہوا ہے ۔

لیکن پریم چند نے شہرت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی کیونکہ کوشش سے نہ شہرت حاصل ہوتی ہے اور نہ اس شہرت کا کوئی فائدہ ہے بلکہ اس کا راستہ دوسرا ہے ۔ پریم چند لکھتے ہیں " اگر ہم سچے دل سے جماعت کی خدمت کریں گے تو اعزاز و امتیاز اور شہرت بھی ہمارے قدم چومے گی ۔ پھر اعزاز و امتیاز کی فکر ہمیں کیوں ستائے اور اس کے نہ ملنے سے ہم مایوس کیوں ہوں ؟ خدمت میں جو روحانی مسرت ہے وہی ہمارا صلہ ہے "

پھر بھی ہر ایک آدمی کے دل میں شہرت کی جو تمنا ہوتی ہے ، اس کی وجہ کیا ہے ؟ پریم چند اپنی کہانی " ادیب کا فرض " میں اس کی وجہ بیان کرتے ہیں ۔ ادیب اپنی بیوی سے مخاطب ہے " اب میں تمھیں کیسے سمجھاؤں ، ہر ایک شخص کے دل میں عزت اور احترام کی ایک بھوک ہوتی ہے ۔ تم پوچھو گی یہ بھوک کیوں ہوتی ہے ؟ اس لئے کہ یہ ہمارے روحانی ارتقار کی ایک منزل ہے ۔ ہم عالم گیر وسیع عظمت کا ایک جز ہیں جز میں کل کا وصف ہونا لازمی ہے ، اس لئے شہرت اور عزت روحانی ترقی اور تعلیم کی طرف ہمارا فطری رجحان ہے ۔ میں اس خواہش کو بُرا نہیں سمجھتا "

شہرت کا جذبہ ارتقار کی خواہش کا اظہار ہے اور وہ تبھی حاصل ہوسکتی ہے جب آدمی زندگی کے مجموعی ارتقار، تاریخی حقیقتوں کو آگے بڑھانے میں مدد کرے۔ آدمی اپنے انفرادی ارتقار کو اس طرح انسانیت کے مجموعی ارتقار میں شامل کر دے جس طرح چھوٹے چھوٹے نالے اپنے آپ کو بڑی ندی میں مدغم کر دیتے ہیں اور ندی کا بہاؤ بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے، اور وہ زندگی کو شاداب، زرخیز اور خوش حال بنانے کا کام کرتی ہے۔ یہی عمل، عمل اور یہی قربانی، قربانی ہے۔ جو عمل اور قربانی اس روش سے ہٹ کر کی جاتی ہے اس کا نتیجہ شہرت نہیں بدنامی ہے۔ اور وہ زندگی کے لئے غیر مفید ہے، کیوں کہ اس کا مقصد ارتقار کو آگے بڑھانے کی بجائے اُسے روکنا ہوتا ہے۔

پریم چند نے یقیناً زندگی کے ارتقار میں اضافہ کیا ہے دراصل وہ بذات خود ارتقار کی تحریک تھے۔ جوں جوں ادب کی ترقی پسند تحریک اپنی روایات کو برقرار رکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے اور پھیل رہی ہے اُن کی شہرت بھی نمایاں ہوتی اور پھیلتی جارہی ہے

پریم چند کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے تنقید حیات کا کام تو بہت کیا ہے، لیکن باعمل اور مثبت کردار بہت ہی کم پیش کئے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے بعد ترقی پسند تحریک کا قافلہ فرائڈ ازم کی پیچ دار وادیوں میں بھٹک گیا تھا۔ اس سے جس قدر تحریک کی ترقی پسند روایات کو نقصان پہنچا اسی قدر پریم چند کی شہرت بھی ماند پڑگئی۔

ہم نے انھیں اصلاح پسند کہہ کر نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اگر پڑھنا بند نہیں کیا تو کم ضرور کر دیا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ فرائڈ کے نظریے نے ہمیں "تجزیۂ نفس" کا وہ انمول گوہر عطا کر دیا ہے جس سے پریم چند واقف ہی نہیں تھے اور اس نظریے کی بدولت ہمارا افسانہ اُن سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ لیکن ہم ان کو اور اپنے آپ کو بھلا رہے تھے۔ پریم چند نے فرائڈازم کو دیکھا، پرکھا اور مسترد کر دیا۔ وہ اپنی کہانی "مس پدما" میں لکھتے ہیں۔

"پدما نے تعلیم سے جو فیض اُٹھایا تھا اس میں نفسیاتی خواہشات کی تکمیل ہی حیات کا مقصد تھی۔ بندش روح کی بالیدگی کے لئے زہر تھی۔ فرائڈ اس کا معبود تھا۔ اور فرائڈ کے نظریے اس کی زندگی کے لئے مشعلِ ہدایت۔ کسی عضو کو باندھ دو، تھوڑے ہی دنوں میں دورانِ خون بند ہو جانے کے باعث بے کار ہو جائے گا۔ فاسد مادہ پیدا کر کے زندگی کو معرضِ خطر میں ڈال دے گا۔ یہ جنون، مراق اور اختلالِ دماغ کی اتنی کثرت ہے، محض اس لئے کہ خواہشات میں رُکاوٹ ڈالا گیا۔ نفسیات کی یہ نئی تنقیح پدما کی زندگی کا مسلمہ اصول تھی۔"

ایک مرتبہ پریم چند اور جینندر کمار کے درمیان ادب پر گفتگو ہو رہی تھی۔ گفتگو کا موضوع ٹیگور اور شرت چندر تھے۔ گفتگو کا آغاز جینندر کے ایک سوال سے ہوا تھا اور وہ جینندر ہی کے الفاظ

میں یہاں درج کی جاتی ہے۔

جینندر نے کہا :- بنگالی ادب دل کو زیادہ چھوتا ہے۔ اس سے آپ
متفق ہیں تو اس کا سبب کیا ہے ؟

پریم چند نے کہا :- متفق تو ہوں۔ سبب، اس میں جنسیت زیادہ ہے
مجھ میں وہ کافی نہیں۔

جینندر ان کی طرف دیکھنے لگے اور پوچھا۔ جنسیت ہے اس سے
وہ ادب دل کو زیادہ چھوتا ہے ؟

پریم چند بولے :- ہاں تو وہ جگہ جگہ REMINISCENT (قابل
یادداشت) ہو جاتا ہے۔ یاد میں احساس کی لطافت زیادہ
ہوتی ہے۔ عزم میں احساس کی ریاضت ہوتی ہے۔ تعمیر کے لئے
دونوں چاہیں۔"

کہتے کہتے ان کی آنکھیں جینندر کو پار کر کہیں دور دیکھنے لگی تھیں
اس وقت ان آنکھوں کی سرخی ایک دم غائب ہو کر ان میں ایک طرح
کی دور اندیشی نیلاہٹ بھر گئی تھی بولے " جینندر مجھے ٹھیک
نہیں معلوم۔ میں بنگالی نہیں ہوں، وہ لوگ تخیل پرست ہیں تخیل
کی پرواز میں جہاں پہنچ سکتے ہیں۔ وہاں میری پہنچ نہیں۔ مجھ میں اتنی
دین نہیں ؟ گیان سے جہاں نہیں پہنچا جاتا وہاں بھی تخیل سے پہنچا
جاتا ہے۔ لیکن جینندر میں سوچتا ہوں ریاضت بھی چاہئے، رابندر
اور شرت دونوں عظیم ہیں۔ لیکن ہندی کے لئے کیا یہی راستہ ہے

یا شاید نہیں۔ ہماری راشٹر بھاشا ہے۔ میرے لئے تو یہ راہ نہیں ہی ہے۔" ("ہنس" اکتوبر ۴۸ ۱۹ء)

اسی لئے پریم چند ایسی شاعری کو خصوصاً غزل کو پسند نہیں کرتے تھے جو صرف زلفوں کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ گئی ہو۔ ایک مرتبہ دیا نارائن نگم نے "زمانہ" کا آتش نمبر نکالا تھا تو پریم چند اُن پر بہت بگڑے تھے کہ اتنے صفحے بیکار ضائع کئے۔ انھیں وہ ادب پسند نہیں تھا جو وقت کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا ہو۔ جنسی ادب کو وہ قومی زوال کا آئینہ خیال کرتے تھے۔ لکھتے ہیں :۔

"بے شک شعر و ادب کا منشار ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرنا ہے۔ لیکن انسان کی زندگی محض جنس نہیں ہے۔ کیا وہ ادب جس کا موضوع جنسی جذبات اور اُن سے پیدا ہونے والے درد و یاس تک محدود ہوں، یا جس میں دنیا اور دنیا کی مشکلات سے کنارہ کش ہونا ہی زندگی کا ماحصل سمجھا گیا ہو، ہماری ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔ جنسیت انسان کا ایک جزو ہے اور جس ادب کا بیشتر حصہ اس سے متعلق ہو۔ وہ اس قوم اور اس زمانے کے لئے فخر کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کے صحیح مذاق ہی کی شہادت دے سکتا ہے۔"

(خطبہ صدارت)

ایک طرف ترقی پسند تحریک پر جنسیت کا غلبہ تھا اور ترقی پسند ادیبوں نے اپنے درمیانہ طبقہ کے اور بورژوا طبقہ کے جنسی

رجحانات اور کمزوریوں کو بیان کرنا ہی کافی سمجھا، اور مزدوروں کسانوں کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں رکھا تو دوسری طرف اصلاح پسند اور گاندھی وادی ادیب تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بھی تھے اور خلاف بھی تھے۔ وہ پریم چند کا جائزہ بھی اپنی ہی فطرت کے مطابق لیتے تھے، اور پریم چند کو ترقی پسند مانتے ہوئے آدھی اصلاح پسند اور گاندھی وادی بنا کر پیش کرتے تھے اور ان کے ادب کے انقلابی کردار کو بالکل نظر انداز کر دیتے تھے۔ ان لوگوں کے کسی ادیب، مفکر اور رہنما کو بڑا بنا کر پیش کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی شہرت سے اُن کے پرانے سماج کو سہارا ملے اور لوگ اس کی ترقی پسند روایات کو بھول کر اسے بے ضرر دیوتا کی طرح پوجتے رہیں۔

ادب کے طبقاتی کردار پر ان کی نظر ہی نہیں جاتی۔ گاندھی ازم تو سیاست کے طبقاتی کردار پر بھی پردہ ڈالتا ہے۔ جو لوگ گاندھی کو اپنے دور کا سب سے بڑا ترقی پسند اور انقلابی کہتے ہیں اگر وہ پریم چند کو بھی ترقی پسند کہتے ہیں تو صرف اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، انھیں انقلاب کی ان محرک قوتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، جو ادب اور انسان کو واقعی ترقی پسند بناتی ہیں جو پریم چند کی تحریروں میں جاری و ساری ہیں۔

روس کے عظیم فن کار طالستائی کے ساتھ بھی بورژوا طبقہ کے ادیبوں نے یہی سلوک کیا تھا۔ طالستائی نے اپنے ناولوں اور کہانیوں

میں زار شاہی سماج پر جو نکتہ چینی کی ہے۔ حاکم طبقہ کے مظالم اور بے انصافیوں کے خلاف جو آواز بلند کی ہے، غریب کسانوں کی امنگوں اور آرزوؤں کو لاوے کی طرح اُبلتے ہوئے دکھایا ہے اس سے اُنھیں کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو صرف طالستائی کے نام سے اپنے آپ کو وابستہ کرکے اپنے سیاسی سرمایہ میں اضافہ کرتے رہے۔ صرف لینن نے طالستائے کے ادب کے انقلابی کردار کو پیش کیا اور بتایا کہ کیسے ممکن تھا کہ جب ملک میں اتنی بڑی ہل چل تھی تو طالستائے ایسا سچ مچ بڑا ادیب اس کے کچھ اہم پہلوؤں کو منعکس نہ کرتا۔

اب جبکہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ملک کی سیاست کا طبقاتی کردار ابھر کر لوگوں کے سامنے آگیا ہے اور ادبی تحریک بھی واضح طور پر دو کیمپوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ پریم چند کا نئے شعور کے ساتھ جائزہ لیا جارہا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے بعض دوست پریم چند کو طالستائے سے مشابہت دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک کسانوں کی لوٹ کھسوٹ اور حاکم طبقے کے ظلم اور بے انصافی کے خلاف احتجاج کرنے کا تعلق ہے۔ دونوں میں مشابہت ہے۔ لیکن دونوں میں ایک بڑا فرق ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ فرق یہ ہے کہ طالستائے شروع سے اصلاح پسند تھے، اور آخر میں بالکل پادری بن گئے وہ روسی کسانوں پر ہونے والے ظلم اور دکھ کی کہانیاں بیان کرتے

رہے لیکن جب یہی کسان انقلاب کے لئے تیار ہوئے تو طالستائے کا زمیندارانہ کردار جاگ اُٹھا ۔ انھوں نے انقلاب سے گھبرا کر چرچ میں پناہ لی ، اور مذہب کا پرچار کرنے لگے ۔ اُن کی مذہبی رنگ کی کتابیں ہمارے ہاں گاندھی ازم کا پرچار کرنے کے لئے خوب استعمال ہوئیں اور اب تک ہو رہی ہیں ۔ اس کے برعکس پریم چند مذہب کے قائل نہیں تھے بلکہ مذہب کو ریاکاری کا زیور سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ قسم کذب کی تائید ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی اصلاح پسندی انقلاب میں تبدیل ہو رہی تھی آخری عمر میں اصلاح پسندی کے جو تھوڑے بہت عناصر باقی تھے اُن کے دور ہو جانے کا امکان تھا ۔ طالستائے نے نادانستہ طور پر انقلاب کی محرک قوتوں کا عکس پیش کیا ہے ۔ پریم چند نے زیادہ دانستہ انقلاب کی قوتوں کو ابھارا ہے ۔ پریم چند کا ارتقا جاری تھا جبکہ طالستائے نے آخری عمر میں ارتقا کو جواب دے دیا تھا ۔

ملک میں جوں جوں انقلاب کی محرک قوتیں ابھر رہی ہیں ، ذہن صاف ہو رہے ہیں ۔ پریم چند کی شہرت اور عظمت بھی اُبھر رہی ہے اور ادب کی ترقی پسند تحریک جس کی انھوں نے داغ بیل ڈالی تھی بھول بھلیوں سے نکل کر صحیح راہ پر چل پڑی ہے ۔

ضمیمہ

191ء میں لکھنؤ میں ہونے والے انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس میں پریم چند نے بحیثیت صدر یہ خطبہ پڑھا تھا

خطبۂ صدارت

حضرات! یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے
ہمارے سمیلنوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی
اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا جو
لٹریچر موجود ہے اس کا منشا رخیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ
محض زبان کی تعمیر تھا۔ وہ بھی نہایت ہی اہم کام تھا۔ جب تک زبان
ایک مستقل صورت نہ اختیار کرلے اس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے
کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی
زبان کی تعمیر کرکے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لئے ہم ان کے مشکور
نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی۔ لیکن زبان ذریعہ ہے منزل

نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کر لی ہے کہ ہم زبان سے گذر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہو، وہی زبان جس میں ابتداً باغ و بہار اور بیتال پچیسی کی تصنیف ہی معراج کمال تھی، اب اس قابل ہو گئی ہے کہ علم و حکمت کے مسائل بھی ادا کرے۔

اور یہ جملہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔ زبان بول چال کی بھی ہوتی ہے اور تحریر کی بھی۔ بول چال کی زبان تو میرامن اور للو لال کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ انھوں نے جس زبان کی داغ بیل ڈالی وہ تحریر کی زبان تھی اور وہی اب ادب ہے۔ ہم بول چال سے اپنے قریب کے لوگوں سے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں، اپنی خوشی یا رنج کے جذبات کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ادیب وہی کام تحریر سے کرتا ہے۔ ہاں اس کے سننے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، اور اگر اس کے بیان میں حقیقت اور سچائی ہے تو صدیوں اور قرنوں تک اس کی تحریریں دلوں پر اثر کرتی رہتی ہیں۔ میرا یہ منشا نہیں کہ جو کچھ سپرد قلم ہو جائے وہ سب کا سب ادب ہے۔ ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو، جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو، اور جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو۔ اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کیے گئے ہوں۔ طلسماتی حکایتوں یا بھوت پریت کے قصوں

یا شہزادوں کے حسن و عشق کی داستانوں سے ہم کسی زمانے میں متاثر ہوئے ہوں لیکن اب ان میں ہمارے لئے بہت کم دلچسپی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرت انسانی کا ماہر ادیب شہزادوں کے حسن و عشق اور طلسماتی حکایتوں میں بھی زندگی کی حقیقتیں بیان کرسکتا ہے اور اس میں حسن کی تخلیق کرسکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ لٹریچر میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہو، پھر آپ اُسے جس پس منظر میں چاہے رکھ سکتے ہیں چڑے کی حکایت یا گل و بلبل کی داستان بھی اس کے لئے موزوں ثابت ہو سکتی ہے۔

ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقیدِ حیات ہے۔ چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔ ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخیلات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانہ عجائب کی داستان تھی، کہیں بوستانِ خیال کی اور کہیں چندر کانتا سنتتی کی۔ ان داستانوں کا منشا محض دل بہلانا تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین۔ لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق ہے، اس میں کلام ہی نہ تھا، بلکہ یہ مسلّم تھا۔ قصہ قصہ ہے۔ زندگی زندگی۔ دونوں متضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ شعرا پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا عشق کا معیار نفس پرستی

تھا، اور حسن کا دیدہ زیبی۔ انھیں جنسی جذبات کے اظہار میں شعرا اپنی جدت اور جولانی کے معجزے دکھاتے تھے۔ شعر میں کسی نئی نیارش، یا نئی تشبیہہ یا نئی پرواز کا ہونا داد پانے کے لئے کافی تھا۔ چاہے وہ حقیقت سے کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو، یاس اور درد کی کیفیتیں آشیانہ اور قفس، برق اور خرمن کے تخیل میں اس خوبی سے دکھائی جاتی تھیں کہ سننے والے دل تھام لیتے تھے، اور آج بھی وہ شاعری کس قدر مقبول ہے۔ اسے ہم اور آپ خوب جانتے ہیں۔ بے شک شعر اور ادب کا منشا، ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرتا ہے۔ لیکن انسان کی زندگی محض جنسی نہیں ہے، کیا وہ ادب جس کا موضوع جنسی جذبات اور اُن سے پیدا ہونے والے درد و یاس تک محدود ہو یا جس میں دنیا اور دنیا کی مشکلات سے کنارہ کش ہونا ہی زندگی کا ماحصل سمجھا گیا ہو ہماری ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے؟ جنسیت انسانیت کا ایک جزو ہے اور جس ادب کا بیشتر حصہ اسی سے متعلق ہو وہ اس قوم اور اس زمانے کے لئے فخر کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کے صحیح مذاق ہی کی شہادت دے سکتا ہے۔ کیا ہندی اور کیا اردو شاعری دونوں کی ایک ہی کیفیت ہے۔ اس وقت ادب و شاعری کا جو مذاق تھا اس کے اثر سے بے نیاز ہونا آسان نہ تھا۔ تحسین اور قدر دانی کی ہوس تو ہر ایک کو ہوتی ہے۔ شعرا کے لئے اپنا کلام ہی ذریعہ معاش تھا۔ اور کلام کی قدر دانی رؤسا اور امرا کے علاوہ اور کون کر سکتا۔ ہمارے

شعراء کو عام زندگی کا سامنا کرنے اور اس کی حقیقتوں سے متاثر
ہونے کے لئے یا تو موقع ہی نہ تھا یا ہر خاص و عام پر ایسی ذہنی پستی چھائی
ہوئی تھی کہ ذہنی اور شعوری زندگی رہ ہی نہ گئی تھی۔ ہم اس وقت کے ادیبوں
پر اس کا الزام نہیں رکھ سکتے۔ ادب اپنے زمانے کا عکس ہوتا ہے جو جذبات
اور خیالات لوگوں کے دلوں میں ہل چل پیدا کرتے ہیں وہی ادب میں بھی
اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔ ایسی پستی کے زمانے میں یا تو لوگ عاشقی کرتے ہیں
یا تصوف اور ویراگ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کی
شاعری اور ادب دونوں اسی قسم کے ہیں۔ جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی
غالب ہو اور ایک لفظ یاس اور شکوۂ روزگار اور معاشقہ میں ڈوبا
ہوا ہو تو سمجھ لیجئے کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی اور اس میں سعی
اور اجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی اور اس نے درجاتِ عالیہ کی طرف
سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اور مشاہدے کی قوت غائب ہو گئی ہے۔

مگر ہمارا ادبی مذاق بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ ادب
محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور
بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا
بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو
حل کرتا ہے۔ وہ اب تحریک یا ابہام کے لئے حیرت انگیز واقعات
تلاش نہیں کرتا یا قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا بلکہ اس کو ان مسائل
سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے ہیں

اس کی فضیلت کا موجودہ معیار جذبات کی وہ شدت ہے جس سے ہمارے جذبات اور خیالات میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اخلاقیات اور ادبیات کی منزل مقصود ایک ہے۔ صرف ان کے طرز خطاب میں فرق ہے۔ اخلاقیات دلیلوں اور نصیحتوں سے عقل اور ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادب نے اپنے لئے کیفیات اور جذبات کا دائرہ چن لیا ہے، ہم زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں یا ہم پر جو کچھ گذرتی ہے وہی تجربات اور وہی چوٹیں تخیل میں جاکر تخلیق ادب کی تحریک کرتی ہیں۔ شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدت احساس ہوتی ہے، اتنا ہی اس کا کلام دل کش اور بلند ہوتا ہے جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح نہ بیدار ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرکت نہ پیدا ہو۔ ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکل پر فتح پانے کے لئے سچا استقلال نہ پیدا کرے، وہ آج ہمارے لئے بے کار ہے، اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ زمانہ قدیم میں مذہب کے ہاتھوں میں سوسائٹی کی لگام تھی۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی تہذیب مذہبی احکام پر مبنی تھی اور وہ تخویف یا تحریض سے کام لیتا تھا، عذاب و ثواب کے مسائل اس کے آلہ کار تھے۔ اب ادب نے یہ خدمت اپنے ذمے لی ہے اور اس کا آلہ کار ذوق حسن ہے۔ وہ انسان میں اس ذوق حسن کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حسن کا احساس نہ ہو۔ ادیب میں

یہ احساس جتنا ہی بیدار اور پرعمل ہوتا ہے اتنی ہی اس کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے (فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوت احساس کے ذریعے اس میں جذبۂ حسن کی اتنی تیزی ہو جاتی ہے کہ جو کچھ قبیح ہے غیر مستحسن ہے، انسانیت سے خالی ہے، وہ اس کے لئے ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ نیز وہ بیان اور جذبات کی ساری قوت سے وار کرتا ہے۔ یوں کہیئے وہ انسانیت کا، علویت کا شرافت کا علم بردار ہے۔ جو پامال ہیں، مظلوم ہیں، محروم ہیں، چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت اُن کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے۔ اس کی عدالت سوسائٹی ہے۔ اسی عدالت کے سامنے وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے اور اس کے احساس حق اور انصاف اور جذبہ حسن کی تالیف کر کے اپنی کوشش کو کامیاب سمجھتا ہے، مگر عام وکلا کی طرح وہ اپنے مؤکل کی جانب سے جا و بیجا دعوے پیش نہیں کرتا مبالغے سے کام نہیں لیتا، اختراع نہیں کرتا، وہ جانتا ہے کہ ان ترکیبوں سے وہ سوسائٹی کی عدالت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس عدالت کی تالیف جبھی ممکن ہے جب آپ حقیقت سے ذرا بھی منحرف نہ ہوں ورنہ عدالت آپ سے بدظن ہو جائے گی، اور آپ کے خلاف فیصلہ سنا دے گی۔ وہ افسانہ لکھتا ہے مگر واقعیت کے ساتھ، وہ مجسمہ بناتا ہے مگر اس طرح کہ اس میں حرکت بھی ہو اور قوت اظہار بھی ہو وہ فطرت انسانی کا باریک نظروں سے مشاہدہ کرتا ہے، وہ نفسیات کا مطالعہ

کرتا ہے، اور کوشش کرتا ہے کہ اس کے کیرکٹر ہر حالت میں اور ہر موقع پر اس طرح برتاؤ کریں کہ جیسے گوشت پوست کے انسان کرتے ہیں۔ وہ اپنی طبیعی ہمدردی اور حسن پسندی سے زندگی کے اُن نکات پر جا پہنچتا ہے جہاں انسان اپنی انسانیت سے معذور ہو جاتا ہے، اور واقعہ نگاری کا رجحان یہاں تک رو بہ ترقی ہے کہ آج کا افسانہ ممکن حد تک مشاہدے سے باہر نہیں جاتا۔ ہم محض اس خیال سے تسکین نہیں پاتے کہ نفسیاتی اعتبار سے یہ سبھی کیریکٹر انسانوں سے ملتے جلتے ہیں، بلکہ ہم یہ اطمینان چاہتے ہیں کہ وہ واقعی انسان ہیں۔ اور مصنف نے حتی الامکان ان کی سوانح عمری لکھی ہے، کیونکہ تخیل کے انسان میں ہمارا عقیدہ نہیں ہے، ہم اس کے فعلوں اور خیالوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ہمیں یہ تحقیق ہو جانا چاہیئے کہ مصنف نے جو تخلیق کی ہے وہ مشاہدات کی بنا پر ہے یا وہ خود اپنے کیرکٹروں کی زبان سے بول رہا ہے۔ اسی لئے ادب کو بعض نقادوں نے، مصنف کی نفسیاتی سوانح عمری کہا ہے۔ ایک ہی واقعہ یا کیفیت سے سبھی انسان یکساں طور پر متاثر نہیں ہوتے۔ ہر شخص کی ذہنیت اور زاویۂ نظر الگ ہے۔ مصنف کا کمال اسی میں ہے کہ وہ جس ذہنیت یا زاویہ سے کسی امر کو دیکھے اس میں اس کا پڑھنے والا بھی اس کا ہم خیال ہو جائے۔ یہی اس کی کامیابی ہے۔ اسی کے ساتھ ہم ادیب سے یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ وہ اپنی بیدار مغزی، اپنی وسعت خیال سے

ہمیں بیدار کرے، ہم میں وسعت پیدا کرے، اس کی نگاہ اتنی باریک، اتنی گہری اور اتنی وسیع ہو کر ہمیں اس کے کلام سے روحانی سرور اور تقویت حاصل ہو۔

بہتر بننے کی تحریک ہر انسان میں موجود ہوتی ہے، ہم میں جو کمزوریاں ہیں وہ کسی مرض کی طرح چمٹی ہوئی ہیں، جیسے جسمانی تندرستی ایک فطری امر ہے اور بیماری بالکل غیر فطری اسی طرح اخلاقی اور ذہنی صحت بھی فطری بات ہے اور ہم ذہنی اور اخلاقی پستی سے اسی طرح مطمئن نہیں ہوتے جیسے کوئی مریض اپنے مرض سے مطمئن نہیں ہوتا ہے۔ جیسے وہ ہمیشہ کسی طبیب کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی اسی فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی کمزوریوں کو پرے پھینک کر بہتر انسان بن جائیں۔ اس لئے ہم سادھو اور فقیروں کی جستجو کرتے ہیں، پوجا پاٹ کرتے ہیں، بزرگوں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں، علماء کی تقریریں سنتے ہیں اور ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، اور ہماری ساری کمزوریوں کی ذمہ دار ہماری بد مزاقی اور محبت کے جذبے سے محروم ہونا ہے۔

جس میں صحیح ذوقِ حسن ہے، جس میں محبت کی وسعت ہے، وہاں کمزوریاں کیسے رہ سکتی ہیں، محبت ہی تو روحانی غذا ہے، اور ساری کمزوریاں اسی روحانی غذا کے نہ ملنے سے یا مضر غذا کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں آرٹسٹ ہم میں حسن کا احساس پیدا کر دیتا ہے اور محبت کی گرمی اس کا ایک فقرہ ایک لفظ، ایک کنایہ اس طرح ہمارے اندر جا بیٹھتا ہے کہ ہماری روح

خود اس نور سے منور نہ ہو تو ہمیں یہ روشنی کیوں کر عطا کر سکتا ہے۔
سوال یہ ہے کہ حسن کیا شے ہے؟ بظاہر یہ ایک مہمل سا سوال معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حسن کے متعلق ہمیں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ ہم نے آفتاب کا طلوع و غروب دیکھا ہے، شفق کی سرخی دیکھی ہے خوش نما اور خوشبودار پھول دیکھے ہیں، خوش نوا چڑیاں دیکھی ہیں، نغمہ خواں ندیاں دیکھی ہیں، ناچتے ہوئے آبشار دیکھے ہیں۔ ان نظاروں میں ہماری روح کیوں کھل اٹھتی ہے؟ اس لئے کہ ان میں رنگ یا آواز کی ہم آہنگی ہے۔ سازوں کی ہم آہنگی ہی سنگیت کی دل کشی کا باعث ہے ہماری ترکیب ہی عناصر کے توازن سے ہوئی ہے اور ہماری روح ہمیشہ اسی توازن، اسی ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے۔ ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے، اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے، تخریب نہیں۔ وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشو و نما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں وہیں استحکام ہے۔ زندگی ہے، جہاں ان کا فقدان ہے، وہیں افتراق خود پروری ہے اور نفرت اور دشمنی ہے اور موت ہے۔ یہ افتراق غیر فطری زندگی کی علامتیں ہیں، جیسے بیماری غیر فطری زندگی کی۔ جہاں فطرت سے مناسبت اور توازن ہے، وہاں تنگ خیالیوں اور خود غرضیوں کا وجود کیسے ہوگا۔ جب ہماری روح فطرت کی کھلی ہوئی فضا میں نشو و نما پاتی ہے تو خباثتِ نفس کے جراثیم خود بخود ہوا اور روشنی سے

مرجاتے ہیں۔ فطرت سے الگ ہو کر اپنے کو محدود کرنے سے ہی یہ ساری ذہنی اور جذباتی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بنانا چاہتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اسی کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہ اس کا مقصد اولیٰ ہے۔

ترقی پسند مصنفین کا عنوان میرے خیال میں ناقص ہے۔ ادیب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقتاً ترقی پسند ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو شاید وہ ادیب نہ ہوتا۔ وہ آئیڈیلسٹ ہوتا ہے۔ اسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور باہر بھی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اس کی روح بے قرار رہتی ہے۔ وہ اپنی تخیل میں فرد اور جماعت کو مسرت اور آزادی کی جس حالت میں دیکھنا چاہتا ہے وہ اسے نظر نہیں آتی۔ اس لئے موجودہ ذہنی اور اجتماعی حالتوں سے اس کا دل بیزار ہوتا ہے۔ وہ ان ناخوشگوار حالات کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے تاکہ دنیا مرنے اور جینے کے لئے بہتر جگہ ہو جائے۔ یہی درد اور یہی جذبہ اس کے دل و دماغ کو سرگرم کار رکھتا ہے۔ اس کا حساس دل یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک جماعت کیوں معاشرت و رسوم کی قیود میں پڑ کر اذیت پاتی رہے۔ کیوں نہ وہ اسباب مہیا کئے جائیں کہ وہ غلامی اور عسرت سے آزاد ہو۔ وہ اس درد کو جتنی بے تابی کے ساتھ محسوس کرتا ہے اتنا ہی اس کے کلام میں زور اور خلوص پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کو جس تناسب سے ادا کرتا ہے وہی اس کے

کمال کا راز ہے ، مگر شاید اس تخصیص کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ
ترقی کا مفہوم ہر مصنف کے ذہن میں ایکساں نہیں ہے۔ جن خیالات کو
ایک جماعت ترقی سمجھتی ہے انھی کو دوسری جماعت عین زوال سمجھتی ہے
اس لئے ادیب اپنے آرٹ کو کسی مقصد کے تابع نہیں کرنا چاہتا۔ اس
کے خیال میں آرٹ صرف جذبات کے اظہار کا نام ہے ۔ ان جذبات سے
فرد یا جماعت پر خواہ کیسا ہی اثر پڑے ترقی کا ہمارا مفہوم وہ صورت
حالات ہے جس سے ہم میں استحکام اور قوت عمل پیدا ہو۔ جس سے ہمیں
اپنی خستہ حالی کا احساس ہو۔ ہم دیکھیں کہ ہم کن داخلی اور خارجی اسباب
کے زیر اثر اس جمود وانحطاط کی حالت کو پہنچ گئے ہیں ، اور انھیں دور
کرنے کی کوشش کریں ۔ ہمارے لئے وہ شاعرانہ جذبات بے معنی ہیں ،
جن سے دنیا کی بے ثباتی ہمارے دل پر اور زیادہ مسلط ہو جائے
جن سے ہمارے دلوں پر مایوسی طاری ہو جائے ۔ وہ حسن و عشق کی
داستانیں جن سے ہمارے رسائل بھرے ہوتے ہیں ، ہمارے
لئے بے معنی ہیں۔ اگر وہ ہم میں حرکت اور حرارت پیدا نہیں کرتے۔ اگر
ہم نے دو نوجوانوں کے حسن و عشق کی داستان کہہ ڈالی مگر اس سے
ہمارے ذوق حسن پر کوئی اثر نہیں پڑا اور پڑا بھی تو صرف اتنا کہ ہم
ان کی ہجر کی تکلیفوں پر رو دئے تو اس سے ہم میں کون سی ذہنی یا ذوقی
حرکت پیدا ہوئی۔ ان باتوں سے ہمیں کسی زمانے میں وجد آیا ہو مگر
آج کے لئے وہ بے کار ہیں۔ اس جذباتی آرٹ کا اب زمانہ نہیں رہا۔

اب تو ہمیں اس آرٹ کی ضرورت ہے جس میں عمل کا پیغام ہو۔ اب تو حضرت اقبال کے ساتھ ہم بھی کہتے ہیں ؎

رمزِ حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی
در قلزم آرمیدن ننگ است آب جو را
بہ آشیاں نہ نشینم ز لذتِ پرواز
گہے بہ شاخِ گلم گاہ بر لبِ جویم

چنانچہ ہمارے مشرب میں داخلیت وہ شے ہے جو جمود، پستی، سہل انگاری کی طرف لے جاتی ہے اور ایسا آرٹ ہمارے لئے نہ انفرادی حیثیت سے مفید ہے نہ اجتماعی حیثیت سے مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان میں تولتا ہوں بے شک آرٹ کا مقصد ذوقِ حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے۔ لیکن ایسی کوئی ذوقی معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی ہے اور غم بھی آسمان پر چھائی ہوئی شفق بے شک ایک خوش نما نظارہ ہے، کہیں اساڑھ میں اگر آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ ہمارے لئے خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔ اس وقت تو ہم آسمان پر کالی کالی گھٹائیں دیکھ کر ہی مسرور ہوتے ہیں۔ پھولوں کو دیکھ کر ہم اس لئے محظوظ ہوتے ہیں کہ ان سے پھل کی امید ہوتی ہے۔ فطرت سے

ہم آہنگی اسی لئے ہماری روحانی مسرت کا باعث ہے کہ اس سے ہمیں زندگی میں
نمو اور تقویت ملتی ہے۔ فطرت کا قانون نمو اور ارتقا ہے اور جن جذبات
کیفیات یا خیالات سے ہمیں مسرت ہوتی ہے وہ اسی نمو کے معاون ہیں
آرٹسٹ اپنے آرٹ سے حسن کی تخلیق کر کے اسباب اور حالات کو بالیدگی
کے لئے ساز گار بناتا ہے۔

مگر حسن بھی اور چیزوں کی طرح مطلق نہیں۔ اس کی حیثیت بھی اضافی
ہے۔ ایک رئیس کے لئے جو چیز مسرت کا باعث ہے وہی دوسرے کے
لئے رنج کا سبب ہو سکتی ہے۔ ایک رئیس اپنے شگفتہ شاداب باغیچہ میں
بیٹھ کر چڑیوں کے نغمے سنتا ہے تو اسے جنت کی مسرت حاصل ہوتی ہے
لیکن ایک نادار لیکن باخبر انسان اس امارت کے لوازمے کو مکروہ ترین
چیز سمجھتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے خون سے داغدار ہو رہی ہے
اخوت اور مساوات، تہذیب اور معاشرت ابتدا سے ہی آئیڈیلسٹوں
کا زریں خواب رہی ہے۔ پیشوایان دین نے مذہبی، اخلاقی اور روحانی
بندشوں سے اس خواب کو حقیقت بنانے کی متواتر ناکام کوششیں کی
ہیں، مہاتما بدھ۔ حضرت عیسیٰ۔ حضرت محمد سبھی نے اخلاقی بنیاد
پر مساوات کی یہ عمارت کھڑی کرنی چاہی مگر کسی کو پوری کامیابی نہ ہوئی۔ اور
آج اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفاوت جتنی بے دردی سے نمایاں ہو رہی ہے
شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔

آزمودہ را آزمودن جہل است کے مصداق اب بھی دھرم اور

اخلاق کا دامن پکڑ کر ہم اس مساوات کی منزل پر پہنچنا چاہیں تو ہمیں ناکامی ہوگی۔ کیا ہم اس خواب کو پریشان دماغ کی خلاقی سمجھ کر بھول جائیں؟ تب تو انسان کی ترقی و تکمیل کے لئے کوئی آئیڈیل ہی باقی نہ رہ جائے گا اس سے تو کہیں بہتر ہے انسان کا وجود ہی مٹ جائے۔ جس آئیڈیل کو ہم نے تہذیب کے آغاز سے پالا ہے جس کے لئے انسان نے خدا جانے کتنی قربانیاں کی ہیں جس کی تکمیل کے لئے مذاہب کا ظہور ہوا، انسانی معاشرت کی تاریخ اس آئیڈیل کی تکمیل کی تاریخ ہے۔ اسے مسلمہ سمجھ کر، ایک نہ مٹنے والی حقیقت سمجھ کر ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ ایک نئے نظام کی تکمیل کرنی ہے جہاں وہ مساوات محض اخلاقی بنیادوں پر نہ رہ کر قوانین کی صورت اختیار کرے۔

ہمارے لٹریچر کو اسی آئیڈیل کو پیش نظر رکھنا ہے۔ ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انھیں کی قدر دانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھی کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح و تفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔ انھیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا۔ اگر کبھی وہ ان کا ذکر بھی کرتا تو مضحکہ اڑانے کے لئے اس کی دہقانی وضع اور معاشرت پر ہنسنے کے لئے اس کا "شین" "قاف" درست نہ ہونا یا

محاوروں کا غلط استعمال ظرافت کا ازلی سامان تھا، وہ بھی انسان ہے اس
کے بھی دل ہے۔ اس میں بھی آرزوئیں ہیں۔ یہ آرٹسٹ کے ذہن سے بعید تھا۔
آرٹ نام تھا، اور اب بھی ہے محدود صورت پرستی کا، الفاظ کی ترکیبوں کا
خیالات کی بندشوں کا، اس کے لئے کوئی آئیڈیل نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی اونچا مقصد
نہیں ہے، بھگتی اور ویراگ تصوف اور دنیا سے کنارہ کشی اس کے بلند ترین
تخیلات ہیں۔ اس کے لئے یہی معراج زندگی ہے۔ اس کی نگاہ بھی اتنی وسیع
نہیں ہوئی ہے کہ وہ کش مکش حیات میں حسن کی معراج دیکھے۔ فاقہ و عریانی میں
بھی حسن کا وجود ہو سکتا ہے۔ اسے شاید وہ تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے لئے حسن حسین
عورت میں ہے۔ غریب بے حسن عورت میں نہیں۔ جو بچے کو کھیت کی میڑ پر سلائے
پسینہ بہا رہی ہے۔ اس نے طے کر لیا ہے کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں اور
ابروؤں میں فی الواقعی حسن کا باس ہے، الجھے ہوئے بالوں پپڑیاں پڑے ہوئے
ہونٹوں اور کمھلائے ہوئے رخساروں میں حسن کا گذر کہاں۔ لیکن یہ اس کی
تنگ نظری کا قصور ہے۔ اگر اس کی نگاہ حسن میں وسعت آجائے تو وہ دیکھے
گا کہ ان کے ہونٹوں اور رخساروں کی آڑ میں اگر نخوت اور خود آرائی اور
بے حسی ہے تو ان مرجھائے ہونٹوں اور کمھلائے ہوئے رخساروں کی آڑ
میں ایثار، اور عقیدت اور مشکل پسندی ہے۔ ہاں اس میں نفاست نہیں
ملمع نہیں، لطافت نہیں، ہمارا آرٹ شبابیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا
شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے
شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چوچلوں پر سر دھنے میں نہیں ہے

شباب نام ہے آئیڈیلزم کا، ہمت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا۔ اسے تو اقبال کے ساتھ کہنا ہوگا۔

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور، اے ہمتِ مردانہ

یا

چو موج ساز وجودم ز سیل بے پرواست
گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جوئم

اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوگی جب ہماری نگاہ حسنِ عالم گیر ہو جائے گی۔ جب ساری خلقت اس کے دائرے میں آ جائے گی۔ وہ کسی خاص طبقے تک محدود نہ ہوگا۔ اس کی پرواز کے لئے محض باغ کی چار دیواری نہ ہوگی بلکہ وہ فضا جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ تب ہم بدمزاقی کے متحمل نہ ہوں گے۔ تب ہم اس کی جڑ کھودنے کے لئے سینہ سپر ہو جائیں گے تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کر سکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں تب ہماری خوددار انسانیت اس سرمایہ داری اور عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی تبھی ہم صرف صفحۂ کاغذ پر تخلیق کر کے خاموش ہو جائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق اور خودداری اور انسانیت کا منافی نہیں ہے۔ ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے۔ وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی

ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔

یہیں اکثر یہ شکایت ہوتی ہے کہ ادیبوں کے لئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے یعنی ہندوستان کے ادیبوں کو مہذب ملکوں میں تو ادیب سوسائٹی کا معزز رکن ہے اور وزرا اور امرا اس سے ملنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ مگر ہندوستان تو ابھی تک قرونِ وسطیٰ کی حالت میں پڑا ہوا ہے مگر ادب نے جب امرا کی دریوزہ گری کو ذریعہ حیات بنا لیا ہو اور ان تحریکوں اور ہلچلوں اور انقلابوں سے بے خبر ہو۔ جو سوسائٹی میں ہو رہے ہیں۔ اپنی ہی دنیا بنا کر اس میں روتا اور ہنستا ہو تو اس دنیا میں اس کے لئے جگہ نہ ہونا انصاف سے بعید نہیں ہے۔ جب ادیب کے لئے موزوں طبیعت کے سوا کوئی قید نہیں رہی یا اسی طرح جیسے مہاتما بن کے لئے کسی قسم کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی روحانی بلندی ہی کافی ہے تو جیسے مہاتما لوگ در در پھرنے لگے۔ اسی طرح ادیب بھی لاکھوں کی تعداد میں نکل آئے۔ اس میں شک نہیں کہ ادیب پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا لیکن ہم اگر تعلیم اور طلب سے اس فطری عطیے میں اضافہ اور وسعت پیدا کر سکیں تو یقیناً ہم ادب کی زیادہ خدمت کر سکیں گے۔ ارسطو نے بھی اور دوسرے حکما نے بھی ادیبوں کے لئے سخت شرطیں عاید کی ہیں اور ان کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی جذباتی تہذیب اور تربیت کے لئے اصول اور طریقے مقرر کر دئے گئے ہیں۔ مگر آج تو ادیب کے لئے محض ایک رجحان کافی سمجھا جاتا ہے اور بس، اور کسی قسم کی تیاری کی اس کے لئے ضرورت

نہیں۔ وہ سیاسیات، معاشیات یا نفسیات وغیرہ علوم سے بالکل بیگانہ ہو، پھر بھی وہ ادیب ہے۔ حالانکہ ادیب کے سامنے آج کل آئیڈیل رکھا گیا ہے، اس کے مطابق یہ سبھی علوم اس کے جزو خاص بن گئے ہیں اور اس کا رجحان داخلیت یا انفرادیت تک محدود نہیں رہا۔ وہ نفسیاتی اور معاشی ہوتا جاتا ہے۔ وہ اب فرد کو جماعت سے الگ نہیں دیکھتا بلکہ فرد کو جماعت کے ایک حصہ کی شکل میں دیکھتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ جماعت پر حکومت کرے اُسے اپنی غرض کا آلہ بنائے گویا جماعت میں اور اس میں ازلی دشمنی ہے، بلکہ اس لئے کہ جماعت کی ہستی کے ساتھ اس کی ہستی بھی قائم ہے اور جماعت سے الگ وہ صفر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں جنھیں بہترین تعلیم اور بہترین ذہنی قوے ملے ہیں ان کے اوپر سماج کی اتنی ہی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ جس طرح سرمایہ دار کو ہم غاصب اور جابر کہتے ہیں اس لئے کہ وہ عوام کی محنت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اسی طرح ہم اس ذہنی سرمایہ دار کو بھی پرستش کے قابل نہ سمجھیں گے جو سماج کے پیسے سے اور اونچی سے اونچی تعلیم پاکر اُسے اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ سماج سے ذاتی نفع حاصل کرنا ایسا فعل ہے جسے کوئی ادیب کبھی نہ پسند کرے گا۔ اس ذہنی سرمایہ دار کا فرض ہے کہ وہ جماعت کے فائدے کو اپنی ذات سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے وہ ادب کی کسی صنف میں بھی قدم کیوں نہ رکھے اسے اس صنف پر خصوصاً اور عام حالات سے عموماً واقف ہونا چاہیئے۔ اگر ہم بین الاقوامی ادیبوں

کی کانفرنسوں کی رپورٹیں پڑھیں تو ہم دیکھیں گے ایسا کوئی معاشی، تاریخی اور
نفسیاتی مسئلہ نہیں ہے جس پر اُن میں تبادلۂ خیالات نہ ہوتا ہو۔ اس کے
برعکس ہم اپنے مبلغ علم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی بے علمی پر شرم آتی ہے۔ ہم نے
سمجھ رکھا ہے کہ حاضر طبیعت اور رواں قلم ہی ادب کے لئے کافی ہے۔ ہماری
ادبی پستی کا باعث یہی خیال ہے۔ ہمیں اپنے ادب کا علمی معیار اونچا کرنا
پڑے گا، تاکہ وہ جماعت کی زیادہ قابلِ قدر خدمت کر سکے۔ تاکہ جماعت
میں اُسے وہ درجہ ملے جو اس کا حق ہے تاکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ سے
بحث کر سکے، اور ہم دوسری زبانوں اور ادیبوں کے دسترخوان کے جھوٹے
نوالے ہی کھانے پر قناعت نہ کریں۔ بلکہ اس میں خود بھی اضافہ کریں۔ ہمیں
اپنے مذاق اور طبعی میلان کے مطابق موضوع کا انتخاب کر لینا چاہیے۔
اور موضوع پر عالمانہ عبور حاصل کرنا چاہیئے۔ ہم جس اقتصادی حالت میں
زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں یہ کام مشکل ضرور ہے، لیکن ہمارا معیار اونچا
رہنا چاہیئے۔ اگر ہم پہاڑ کی چوٹی تک نہ پہنچ سکے تو کمر تک پہنچ ہی جائیں گے
جو سطح زمین پر پڑے رہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر ہمارا باطن محبت
سے منور ہو اور خدمت کا معیار ہمارے پیش نظر ہو جو اسی محبت کی ظاہری
صورت ہے تو ایسی کوئی مشکل نہیں جس پر ہم فتح نہ پا سکیں۔ جنھیں دولت
اور ثروت پیاری ہے اُن کے لئے ادب کے مندر میں جگہ نہیں ہے یہاں
تو اُن اپاسکوں کی ضرورت ہے، جنھوں نے خدمت کو اپنی زندگی کا حاصل
سمجھ لیا ہے، جن کے دل میں تڑپ ہو اور محبت کا جوش ہو۔ اپنی عزت تو

اپنے ہاتھ ہے۔ اگر ہم سچے دل سے جماعت کی خدمت کریں گے تو اعزاز و امتیاز اور شہرت بھی ہمارے قدم چومے گی۔ پھر اعزاز و امتیاز کی فکر ہمیں کیوں ستائے اور اس کے نہ ملنے سے ہم مایوس کیوں ہوں۔ خدمت میں جو روحانی مسرت ہے وہی ہمارا صلہ ہے۔ ہمیں جماعت پر اپنی حقیقت جتلانے کی، اس پر رعب جمانے کی ہوس کیوں ہو۔ دوسروں سے زیادہ آرام و آسائش سے رہنے کی خواہش ہمیں کیوں ستائے۔

ہم امراء کے طبقہ میں اپنا شمار کیوں کرائیں ہم تو جماعت کے علم بردار ہیں اور سادہ زندگی کے ساتھ اونچی نگاہ ہماری زندگی کا نصب العین ہے جو شخص سچا آرٹسٹ ہے وہ خود پروری کی زندگی کا عاشق نہیں ہو سکتا۔ اسے اپنے قلب کے اطمینان کے لئے نمائش کی ضرورت نہیں۔ اس سے تو اسے نفرت ہوتی ہے، وہ تو اقبال کے ساتھ کہتا ہے۔

مردم آزادم و آں گونہ غیورم کہ مرا
می تواں کشت بہ یک جام زلال دگراں

ہماری انجمن نے کچھ اسی طرح کے اصولوں کے ساتھ میدان میں قدم رکھا ہے وہ ادب کو سمریات اور شبابیات کا دست نگر نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ ادب کو سعی اور عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کا مدعی ہے اسے زبان سے بحث نہیں۔ آئیڈیل کی وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے۔ حسن معنی آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے جو ادیب امراء

کا ہے۔ وہ امرا کا طرز بیان اختیار کرتا ہے جو عوام الناس کا ہے وہ
عوام کی زبان لکھتا ہے۔ ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے،
جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے، اور نشو و نما پا سکے۔ ہم چاہتے
ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے
تعمیری رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں، مضامین پڑھے جائیں، مباحثے
ہوں، تنقیدیں ہوں، جبھی وہ فضا تیار ہوگی۔ جبھی نشاط ثانیہ کا
ظہور ہوگا۔ ہم ہر ایک صوبے میں، ہر ایک زبان میں ایسی انجمنیں کھولنا
چاہتے ہیں، تاکہ اپنا پیغام ہر ایک زبان میں پہنچائیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی
کہ یہ ہماری ایجاد ہے۔ ملک میں اجتماعی جذبات ادیبوں کے دلوں میں
موج زن ہیں۔ ہندوستان کی ہر ایک زبان میں اس خیال کی تخم ریزی
فطرت نے اور حالات روزگار نے پہلے ہی سے کر رکھی ہے۔ جا بجا اس کے
آنکھوے بھی نکلنے لگے ہیں۔ اس کی آبیاری کرنا اس کے آئیڈیل کو تقویت
پہنچانا ہمارا مدعا ہے۔ ہم ادیبوں میں قوت عمل کا فقدان ہے۔ یہ ایک
تلخ حقیقت ہے۔ مگر ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ابھی
تک ہم نے ادب کا جو معیار اپنے سامنے رکھا تھا اس کے لئے عمل کی ضرورت
نہ تھی۔ فقدان عمل ہی اس کا جوہر تھا۔ کیوں کہ بسا اوقات عمل اپنے ساتھ
تنگ نظری اور تعصب بھی لاتا ہے اگر کوئی شخص پارسا ہوکر اپنی پارسائی
پر غرّہ کرے اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ پارسا نہ ہوکر رند ہو۔ رند کی نجات
کی تو گنجائش ہے، پارسائی کے غرور کی تو کہیں شفاعت نہیں۔ بہر حال

جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا محض لوریاں گا گا کر سلانا
محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا، اس وقت تک ادیب کے لئے عمل
کی ضرورت نہ تھی، وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے۔ مگر ہم ادب
کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب
کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو
تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور
ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سُلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ
سونا موت کی علامت ہوگی۔

پریم چند

میں افسانہ کیسے لکھتا ہوں

ایک مرتبہ ایڈیٹر "نیرنگ خیال" لاہور
نے ملک کے مشہور افسانہ نگاروں سے یہ
سوال کیا تھا کہ آپ افسانہ کیوں کر لکھتے ہیں؟
منشی پریم چند نے اس سوال کے جواب میں
یہ مختصر مضمون تحریر کیا تھا۔

میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض واقعہ کے اظہار کے لئے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی۔ میرا قلم ہی

نہیں اُٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیریکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں۔ بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا۔ تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں نہ جما لوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں کہ اس افسانے کے حسب حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پر لطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمیکس موجود ہو تو خواہ وہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہو۔ میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے جس کا نام ہے "دل کی رانی"۔ میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے۔ مجھے فوراً اس تاریخی واقعہ کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا تاریخ میں کلائمیکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی، حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فن حرب کی تعلیم پائی تھی اور میدانِ جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ تیمور نے ہزارہا ترکوں کو قتل کر دیا تھا ایسے دشمن قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوسکی۔ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمیکس نکل آتا تھا۔ تیمور وجیہہ نہ تھا۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی اور جذباتی محاسن پیدا کئے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کر سکیں، اس طرح وہ قصہ تیار ہو گیا۔

کبھی کبھی سُنے سنائے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر افسانے کی بنیاد آسانی سے رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ محض چھپے وار چست عبارت میں لکھنے اور انشا پردازانہ کمالات کی بنا پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں ان میں کلائمیکس لازمی چیز سمجھتا ہوں۔ اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کیے جائیں کہ کلائمیکس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے، جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے تو میں اس موقع سے ضرور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں، یہی کیفیت افسانہ کی روح ہے۔

میں سست رفتار بھی ہوں، مہینے بھر میں شاید میں نے کبھی دو افسانوں سے زائد نہیں لکھے بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا، واقعہ اور کیرکٹر تو سب مل جاتے ہیں لیکن نفسیاتی بنیاد مشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کر سکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے۔ سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں، لیکن شاعری کی طرح اس کے لئے بھی اور اور ادب کے ہر شعبہ کے لئے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے پلاٹ بناتی ہے، ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثیر لاتی ہے، ادبی خوبیاں جمع کرتی ہے، نادانستہ طور پر آپ ہی سب کچھ ہوتا رہتا ہے ہاں قصہ ختم ہو جانے کے بعد میں خود اسے پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے ندرت، کچھ جدت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت

کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اُسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں، ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہوگیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اُسے احباب نے بہت زیادہ پسند کیا۔ اس لئے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔"

پریم چند